بسم اللہ الرحمن الرحیم
بیمہ اور اس کا شرعی حکم
اثر خامہ
محدث کبیر فقیہ جلیل ابو المآثر حضرت مولانا حبیب الرحمن الاعظمی
و
شیخ عبد اللہ ناصح علوان
ترتیب و ترجمہ
مسعود احمد الاعظمی
ناشر
المجمع العلمی
مرکز تحقیقات وخدمات علمیۃ
مرقاۃ العلوم پوسٹ بکس مئو ۔ ۲۷۵۱۰۱ ۔ الہند

بیمہ اور اس کا شرعی حکم

از خامہ

محدث جلیل حضرت مولانا حبیب الرحمٰن الاعظمی

و

شیخ عبداللہ ناصح علوان

ترتیب و ترجمہ

مسعود احمد الاعظمی

ناشر

مرکز تحقیقات و خدمات علمیہ

پوسٹ بکس نمبر ۱، مئو، ۲۷۵۱۰۱ (یوپی - انڈیا)

نام کتاب : بیمہ اور اس کا شرعی حکم

تالیف : محدث جلیل ابوالمآثر حضرت مولانا حبیب الرحمن الاعظمی

〃 : شیخ عبداللہ ناصح علوان

ترجمہ وترتیب : مسعود احمد الاعظمی

صفحات : ۸۰

سن اشاعت : ۱۴۲۳ھ=۲۰۰۲ء

طبع اول : گیارہ سو

قیمت :

ناشر : المجمع العلمی، مرکز تحقیقات وخدمات علمیہ، مئو

باہتمام : مولانا رشید احمد صاحب الاعظمی مدظلہ العالی

ملنے کا پتہ

مرکز تحقیقات وخدمات علمیہ

مرقاۃ العلوم۔ پوسٹ بکس نمبر ۱

مئو-۲۷۵۱۰۱

فہرست مضامین

بسم اللہ الرحمن الرحیم

پیش لفظ

بقلم: حضرت مولانا اعجاز احمد صاحب دام ظلہ العالی

موجودہ دور میں انسان، مال و دولت اور مادی منافع کا ایسا دیوانہ ہے، کہ جب تک مالی منفعت اس کی نگاہ کے سامنے نہ ہو، اس کے دل کے جذبات کسی کارِ خیر کے لیے بھی حرکت نہیں کرتے: ایک وکیل صاحب اپنے ایک قریبی عزیز کے مقدمہ کی پیروی کر رہے تھے، وہ عزیز غریب تھے، وکیل صاحب بغیر فیس کے مقدمہ کو دیکھ رہے تھے، آخری بحث کی تاریخ تھی، یہ عزیز وکیل صاحب کی خدمت میں حاضر تھے، وکیل صاحب مقدمہ کی فائل دیکھ رہے تھے، الٹ رہے تھے، پلٹ رہے تھے، مگر بحث کی گتھی سلجھتی نہ تھی، کافی دیر تک اس کی ترتیب میں الجھے رہے، آخر میں جھنجھلا گئے، فائل پٹک دی اور بے اختیارانہ بولے، میاں! فیس جمع کرو، دماغ کھل نہیں رہا ہے، بات آج سے ۵۴ سال پہلے کی ہے، وکیل صاحب کی فیس ڈھائی سو روپے تھی، وہ عزیز قریب ہوشیار تھے، فیس کی رقم لے کر گئے تھے، انھوں نے فوراً پیش کر دی، اور وکیل صاحب کی بات کھل گئی، اور منٹوں میں بحث کی ساری چولیں بیٹھ گئیں، کامیابی کے بعد وکیل صاحب نے وہ فیس واپس کر دی؛ مگر قابلِ غور بات ہے کہ مادیت کی زنجیروں میں جکڑا ہوا دماغ کھلتا ہی نہیں، جب تک وہ اس کی بو نہیں سونگھ لیتا، یہ اس دور کا عام حال ہے۔

انشورنس (بیمہ) بھی ایک مادی منفعت کا مسئلہ ہے، جس کو شریعتِ

اسلامیہ سے کوئی مناسبت نہیں، شریعت اسلامیہ مادی منفعت سے انسان کو اوپر اٹھا کر محض رضائے الٰہی اور اجر آخرت کی بنیاد پر مسائل زندگی کو حل کرنے کو ترجیح دیتی ہے۔ اور انشورنس کی پالیسی ہو یا بینک کا نظام یہ دونوں کی بنیاد خالص زراندوزی، خود غرضی اور استحصال پر ہے، اسے چاہے جتنے خوشنما عنوان سے پیش کیا جائے، یہ یورپ سے چلی ہوئی، اور یہودیوں کی عیارانہ ذہنیت کے سائے میں پلی ہوئی، ایک بلا ہے، جس پر امداد باہمی کا خوشنما لیبل لگا دیا گیا ہے، یہ بلا جب سمندر پار کر کے ایشیا میں وارد ہوئی، اور مسلمانوں کے درمیان اس نے گھسنے کی کوشش کی، تو علماء اسلام نے اس کا سخت نوٹس لیا، اور اس کی حقیقت کو واضح کر کے اس پر عدمِ جواز کا فتویٰ لگایا؛ مگر یہ بلا پھیلتی گئی، کچھ علماء نے اس کے جواز کے حیلے تلاش کیے۔ غور وخوض ہونے لگا، ایک قلیل تعداد جواز کی طرف مائل ہوئی، بیشتر علماء اس کے خلاف رہے، عرب علماء نے بھی اس پر دادِ تحقیق دی، اور ہندوستانی و پاکستانی علماء نے بھی اسے موضوع فکر بنایا۔

ایک عرب عالم شیخ عبداللہ علوان نے ۱۳۹۸ھ = ۱۹۷۷ء میں اس موضوع پر ایک مختصر سا رسالہ لکھا، اور اسے محدث جلیل حضرت مولانا حبیب الرحمٰن الاعظمی نور اللہ مرقدہ کی خدمت میں بھیجا، انھوں نے اپنے اس رسالہ میں جواز وعدمِ جواز دونوں کے قائلین کے دلائل نقل کیے، پھر ان کے درمیان محاکمہ کیا، ترجیح انھوں نے عدمِ جواز کو دی، بلکہ اس کی پُر زور اور مدلل وکالت کی، اور اس کے ساتھ ہی اسلام کے نظام تعاون وامداد باہمی پر بہت اچھی روشنی ڈالی، اور فیصلہ کیا کہ اسلام نے جو نظامِ تعاون وضع کیا ہے، وہ بہت فطری، اور ہر طرح کی نفسانیت اور خودغرضی کے شائبہ سے پاک ہے۔

حضرت محدث جلیل علیہ الرحمۃ کے نبیرۂ عزیز مولانا مسعود احمد الاعظمی سلمہ اللہ نے اس مفید رسالہ کا اردو میں ترجمہ کر کے اردو داں حضرات کے لیے سے قابل

استفادہ بنا دیا ہے، ترجمہ ماشاءاللہ بہت اچھا عام فہم ہے، قابلِ مطالعہ ہے، انشاءاللہ ہر شخص کو بصیرت حاصل ہوگی، اللہ تعالیٰ اسے نافع بنائے، آمین۔

بیمہ کے موضوع پر محدث کبیر فقیہ جلیل ابوالمآثر حضرت مولانا حبیب الرحمٰن الاعظمی نوراللہ مرقدہ کی بھی ایک تحریر موجود ہے. جو کئی سال قبل "المآثر" کے صفحات کی زینت بن چکی ہے، حضرت محدث جلیل کی یہ تحریر نہایت بصیرت افروز اور فکر انگیز ہے، اس تحریر میں حضرتؒ نے بیمہ کے عدم جواز پر جو دلائل قائم کیے ہیں، وہ بہت ٹھوس، قوی اور ناقابلِ رد ہیں، اس کی ایک ایک سطر حضرتؒ کی فقہی بصیرت، فکری تعمق اور ژرف نگاہی کی شہادت دیتی اور ایمان و یقین کو استحکام اور جلا بخشتی ہے، حضرت کی یہ تحریر ۱۹۶۴ء کی مرقوم ہے، یعنی شیخ علوان صاحب کے رسالہ سے تقریباً ۱۳ سال پہلے معرض وجود میں آئی ہے۔ اس رسالہ کے ترجمہ کی اشاعت کے ساتھ مناسب سمجھا گیا کہ حضرتؒ کی تحریر بھی شائع کر دی جائے تاکہ اس کا فائدہ زیادہ سے زیادہ ہو سکے۔

برادر مخدوم و مکرم حضرت مولانا رشید احمد صاحب الاعظمی زید مجدہ نے دیگر کتابوں کی طرح اس کی طبع و اشاعت کے لیے جو اہتمام فرمایا ہے، اس کے لیے وہ اہل علم کے شکریہ اور مبارکباد کے مستحق ہیں۔ خدا سے دعا ہے کہ مولانا موصوف کی عمر میں برکت عطا فرمائے اور ان کو علم و دین کی خدمت و اشاعت کی مزید توفیق عطا فرمائے: ع

این دعا از من و از جملہ جہاں آمین باد

(مولانا) اعجاز احمد اعظمی

۲۱؍ربیع الاول ۱۴۲۳ھ

بسم اللہ الرحمن الرحیم

تمہید

الحمد لله رب العالمين، و الصلاة و السلام على سيد المرسلين، و على آله و أصحابه أجمعين، و من تبعهم بإحسان إلى يوم الدين، و بعد!

چند دن پہلے کی بات ہے "محدث اعظمیؒ لائبریری" میں کتابیں الٹ پلٹ رہا تھا کہ نگاہ ایک چھوٹی سی کتاب پر پڑی، چھوٹی تقطیع میں ۶۰ صفحات پر مشتمل یہ مختصر سا کتابچہ ہے، کتابچہ عربی زبان میں ہے اور اس کا نام ہے "حكم الاسلام في التأمين" (بیمہ کے بارے میں اسلام کا حکم)۔ اس کے مصنف شیخ عبداللہ ناصح علوان (۱) ہیں، مصنف اپنی کتابوں کے آئینہ میں راسخ العقیدہ، بالغ نظر، صاحبِ فکر و بصیرت اور وسیع المطالعہ عالم معلوم ہوتے ہیں۔ کتاب پر نظر پڑتے ہی اس نے دامنِ دل کھینچ لیا، موضوع اور عنوان کی وجہ سے کتاب پرکشش معلوم ہوئی، اس کے بعد جب اس کو پڑھنا شروع کیا تو اس قدر دلچسپ ثابت ہوئی کہ جب تک اس کو ختم نہیں کر لیا رکھنے کا جی نہیں چاہا۔

کتاب ازبس مفید معلوم ہوئی، اور اسی وقت اس کو اردو کے قالب میں

---

(۱) شیخ موصوف ایک شامی عالم ہیں، پیش نظر کتاب کے علاوہ ان کی دوسری کتابیں بھی ہیں، جو اہل علم میں حسن قبول حاصل کر چکی ہیں۔ حضرت محدث کبیرؒ نے جب ۱۳۹۰ھ میں شام کا سفر فرمایا تھا، تو مؤلف ممدوح نے آپ کی خدمت میں حاضر ہو کر حدیث پاک کی سند و اجازت حاصل کی تھی (مسعود)۔

ڈھالنے کا دل میں خیال پیدا ہوا، قلب میں اس کا داعیہ اتنا شدید پیدا ہوا کہ اسی دن اس کے ترجمہ کا کام بھی شروع کردیا، اور اللہ نے ایسی یکسوئی نصیب فرمائی کہ آج چھبیس دن اس کام سے فراغت حاصل ہوگئی والحمد للہ۔

اس میں کوئی شک نہیں کہ یہ کتابچہ نہایت بیش قیمت، وقیع اور ایمان افروز ہے، اس میں بیمہ کو جائز اور ناجائز قرار دینے والے دونوں کے دلائل، ان کے درمیان موازنہ، ترجیح اور آخر میں اس کا جس طرح متبادل پیش کیا گیا ہے، اس سے کتاب کی اہمیت وعظمت بہت زیادہ ہوگئی ہے، یہ رسالہ دل میں یہ یقین پیدا کرتا ہے کہ مسلم سوسائٹی کی فلاح و بہبود اور کامیابی وکامرانی خدا اور رسول کے احکام پر عمل اور اسلامی شریعت کی پابندی میں ہے، اور اسی میں اہل اسلام کی خیر اور بھلائی کا راز مضمر ہے، اور اسی سے ہمارے اسلاف کو دنیا میں عزت وغلبہ اور سربلندی حاصل ہوئی تھی۔

ترجمہ میں کوشش کی گئی ہے کہ زیادہ سے زیادہ آسان اور سلیس ہو، اور ترجمہ کرتے وقت اردو زبان اور اردو خواں حضرات کی پوری رعایت کی گئی ہے۔ قارئین سے درخواست ہے کہ کتاب کے مؤلف کے ساتھ اس کے مترجم کو بھی دعائے خیر میں فراموش نہ فرمائیں، اللہ تعالیٰ ہم سب کو اسلام پر چلنے اور اپنی مرضیات کے مطابق عمل کرنے کی توفیق عطا فرمائے، آمین۔

....

مذکورہ بالا کتاب کے ترجمہ کے دوران ہی یہ خیال پیدا ہوا کہ حضرت محدث کبیرؒ کی بیمہ والی تحریر کو اگر اس کا دیباچہ بنا دیا جائے، تو بہت مناسب رہے گا، اس سے اس کتابچہ کو سمجھنے میں بھی مدد ملے گی اور اس کی اہمیت وافادیت بھی دوچند ہو جائے گی، اور کتابی شکل میں آنے کے بعد نسبتاً زیادہ محفوظ اور زیادہ شیوع پذیر ہو جائے گی۔ حضرت محدث کبیرؒ کی یہ تحریر پہلی دفعہ ''المآثر'' ج ۳ ش ۲ بابت ربیع الآخر- جمادی

الاولی - جمادی الاخری ۱۴۱۵ھ = اکتوبر - نومبر - دسمبر ۱۹۹۴ء میں شائع کر کے منظر عام پر لائی گئی تھی۔

حضرت محدث کبیرؒ کی اس تحریر کا جو پس منظر اجمالاً ''المآثر'' کے شمارہ نمبر ۲ جلد نمبر ۳ میں ذکر کیا گیا ہے، اس کی عبارت حسب ذیل ہے:

''۱۹۶۴ء کے اوائل کی بات ہے کہ مشہور عالم، مسلم یونیورسٹی علی گڈھ کے ناظم دینیات مولانا محمد تقی امینی علیہ الرحمۃ مجلس تحقیقات شرعیہ ندوۃ العلماء لکھنؤ کی جانب سے لائف انشورنس کے متعلق متعدد مضامین وتحقیقات کی روشنی میں ایک مبسوط اور مفصل تحریر مرتب کر کے، محدث جلیل حضرۃ العلامہ مولانا حبیب الرحمٰن الاعظمی قدس سرہ کی خدمت میں اس کی تائید اور نظر ثانی کی غرض سے لائے، اس تحریر میں انشورنس کے جواز کا رجحان پیش کیا گیا تھا۔ حضرت کو اس سے اختلاف تھا، چنانچہ اس کو پڑھ کر حضرت نے ایک تنقیدی جائزہ اس پر تحریر فرما دیا، اور ایک خط کے ساتھ ان کے پاس بھیج دیا۔ مولانا امینی مرحوم کی تحریر تو بہت طویل ہے، المآثر کے صفحات نہ اس کے متحمل ہیں، اور نہ اس کی ضرورت! حضرت کی تحریر شائع کی جارہی ہے، اہل علم اسے پڑھ کر انشاء اللہ پوری بات سمجھ لیں گے، رسول اللہ ﷺ کا ارشاد ہے: ((اتقوا فراسة المؤمن فإنه ينظر بنور الله)) مومن کی فراست سے ڈرو وہ اللہ کے نور سے دیکھتا ہے، اس کا نمونہ حضرت والا کی یہ گرانمایہ تحریر بھی ہے، آج انشورنس کے نام پر جو فتنہ کھڑا ہو گیا ہے، اور اس سے جو خطرہ لاحق ہے، اس کی نشاندہی حضرت کے اس مضمون اور مکتوب میں آپ بہت واضح لفظوں میں دیکھیں گے کہ ضرورت کے نام پر دین کے بنیادی محرمات کو بھی جائز بنانے کی کوشش ہو رہی ہے۔ فالی اللہ المشتکیٰ۔''

حضرت محدث کبیرؒ کا یہ مضمون جو آگے آرہا ہے، آپ کے رسوخ فی العلم، بلندیٔ فکر، قوت استدلال، گہرائی وگیرائی فہم، فراست اور ایمان ویقین کی بھرپور

شہادت پیش کرتا ہے۔ محدث کبیر حضرت علامہ اعظمیؒ کو اپنے ہم عصر اہل علم میں یہ خصوص و امتیاز حاصل تھا کہ جملہ علوم اسلامیہ میں ان کو مہارت تامہ حاصل تھی، علم حدیث تو ان کا موضوع خاص اور میدان کار تھا، دوسرے علوم میں بھی ان کا رسوخ وتبحر اسی طرح تسلیم شدہ تھا جس طرح علم حدیث میں، تفسیر وفقہ ہو یا علوم عربیت، فلسفہ و کلام ہو یا تاریخ ورجال سب پر ان کو حیرت انگیز قدرت ومہارت حاصل تھی، فقہ میں ان کی امتیازی شان ایسی مسلم تھی کہ ۱۳۶۴ھ = ۱۹۴۵ء میں- جبکہ برصغیر (غیر منقسم ہندوستان) کے طول وعرض میں ایک سے بڑھ کر ایک بلند پایہ اصحاب علم وکمال موجود تھے- آپ کو دارالعلوم دیوبند کی صدارت افتاء کا عظیم الشان منصب پیش کیا گیا، فقہ میں ان کی نگاہ جس قدر باریک اور دوررس تھی، نصوص فقہ اور عبارات فقہاء پر ان کی گرفت جیسی مضبوط تھی، ان کے ہم عصر علماء میں شاید و باید ہی کوئی ان کا ہم پلہ ہو سکتا ہو۔ فقہ میں آپ کی جزرسی اور دقت نظر کا آپ کی کتاب ''انساب وکفاءت کی شرعی حیثیت'' اور'' دارالاسلام اور دارالحرب'' وغیرہ سے اندازہ لگایا جا سکتا ہے۔

بیمہ کے مسئلہ پر پیش نظر تحریر بھی آپ کے فکر ونظر کی جولانی اور بلند پروازی کی شاندار مثال ہے۔اس میں آپ نے مجوزین کے دلائل کا جس انداز میں احتساب کیا ہے اور جس طرح ان پر ردوقدح کی ہے، اس سے یہ مسئلہ واضح، منقح اور بے غبار ہو جاتا ہے، اور قلب میں کسی قسم کی خلش اور خلجان باقی نہیں رہتا۔

حضرت محدث کبیرؒ کی اس تحریر میں اصل مضمون شروع ہونے سے پیشتر حضرت مولانا محمد تقی امینی صاحبؒ کے نام ایک مکتوب بھی ہے، یہ مکتوب بجائے خود ایک بہت ہی قیمتی چیز ہے، جس کو یہاں بھی درج کیا جارہا ہے۔

مسعود احمد الاعظمی

۲۳ر صفر ۱۴۲۳ھ

۷ر مئی ۲۰۰۲ء

مکتوب گرامی حضرت محدث جلیل علیہ الرحمۃ
بنام حضرت مولانا مفتی محمد تقی امینیؒ

پٹھان ٹولہ مئو

۹؍مئی ۱۹۶۴ء

مجی الفاضل! السلام علیکم ورحمۃ اللہ وبرکاتہ!

بیمہ والی تحریر پر اپنے نوٹ بھیج رہا ہوں، میں نے پہلا خط صرف اس لیے لکھا تھا کہ مجھے اس کا کافی اطمینان ہو جائے کہ اظہار اختلاف، بدمزگی پیدا ہونے کا سبب نہ بنے گا؛ باقی رہا قبول کرنا، تو کُل کیا، آپ میری ایک بات بھی قبول نہ کیجئے، میں بُرا نہ مانوں گا۔

ریڈیو کی خبر والی تحریر کو بلا تبصرہ واپس کر رہا ہوں، میں نے اس کو پڑھ لیا ہے، اس سے بھی مجھ کو اسی طرح کا اختلاف ہے، جیسا اختلاف آپ بیمہ والی تحریر سے پائیں گے؛ ہاں اتنا ضرور عرض کروں گا کہ آپ کی یہ تحریر بالکل نامکمل ہے، جب تک کہ آپ ''فرسودہ فقہ'' کے اصول وضوابط کا مکمل و مدلل رد بھی نہ فرمائیں۔

دوسری گزارش یہ ہے کہ ایک فن کی اصطلاح سے دوسرے فن میں کام نہ لیں، جیسا کہ مستفیض کی بحث میں آپ نے کیا ہے۔

تیسری گزارش یہ ہے کہ ہر کلام کو اس کے اصل محمل پر رہنے دیں، مبسوط کی عبارت میں ''حتی یکونَ أمراً مشهوراً'' کا ہرگز وہ مطلب نہیں

ہے، جو آپ سمجھا رہے ہیں۔ اس کا مطلب اس کے سوا اور کچھ نہیں ہے کہ "یہاں تک کہ رویت عام ہو" یعنی چاند دیکھنے والے بکثرت ہوں۔

مولانا! اگر یہ صحیح ہے کہ "فوری طور پر کوئی اجتماعی قدم نہ اٹھایا گیا تو سمجھ دار (ہرنئی رَو میں بہنے والا؟) طبقہ مذہب سے مایوس ہو جائے گا"، تو اسی کے ساتھ اس کا خطرہ بھی کچھ کم نہیں ہے کہ اجتماعی قدم اٹھانے کے جو نمونے سامنے آرہے ہیں، وہ یقین دلا رہے ہیں کہ شریعت حقہ کا کوئی جز بھی اپنی اصلی حالت پر باقی نہ رہے گا، حتی کہ محرمات قطعیہ کو بھی "الضرورات تُبیحُ المحظوراتِ" کے اصول پر مباح بنانے کی گنجائش نکالی جائے گی، کیا آپ کو اس کا اندیشہ نہیں ہے!؟

حبیب الرحمٰن الاعظمی

(بیمہ کی حقیقت اور اس کا حکم)[۱]

۱- بیمہ کی تعریف بالکل ناقص ہے، اس سے بیمہ کی غلط یا صحیح غرض و غایت تو ظاہر ہوتی ہے، مگر اس کی حقیقت واضح نہیں ہوتی؛ اگر بیمہ کی ایسی تعریف کر دی جائے، جس سے اس کی حقیقت واضح ہو جائے، تو اس کا شرعی حکم معلوم کرنے میں آسانی پیدا ہو جائے گی۔

۲- پس اندازی کے رجحان کو فطری کہہ کر ظاہر کرنا کہ وہ تمام تر محمود رجحان ہے، میں اس سے متفق نہیں ہوں۔ فطرتِ سلیمہ کا تقاضا وہ چیز ہے جو محمد رسول اللہ ﷺ کی قولی و عملی تعلیمات سے ثابت ہوتی ہے، جو حریصانہ پس اندازی اور مسرفانہ انفاق کے درمیان ایک نہایت معتدل رجحان ہے، اور جس میں پس اندازی سے زیادہ انفاق کا عنصر نمایاں ہے۔

۳- بیمہ کا اہم مقصد اثاثہ جمع کر کے مستقبل کے غیر متوقع حادثات و خطرات کا مقابلہ کرنا ہے، یہ بات غایۃ الغایات کی حد تک تو کسی درجہ میں صحیح ہو سکتی ہے، لیکن بیمہ کی اولین غرض وہ ہوتی ہے جو ''بیمہ کی قسموں'' کے عنوان کے تحت مذکور ہے، یعنی مال یا اطراف کے امکانی نقصان کی تلافی۔

۴- اسپین کے مسلمانوں نے جس بحری بیمہ کی ابتدا کی تھی، اس کی صورت کیا تھی؟ اور اس کا کیا ثبوت محققینِ یورپ نے پیش کیا ہے؟ جب تک یہ نہ ہو تو اس

[۱] حضرت محدث کبیرؒ کی تحریر میں یہ عنوان نہیں تھا، بعد میں اپنی طرف سے یہ عنوان قائم کیا گیا ہے۔ (مسعود)

حوالہ کا مغالطہ کے سوا کچھ حاصل نہیں ہے؛ بالخصوص جب اس کے ساتھ غلام محمد صاحب کا یہ اضافہ بھی شامل کرلیا جائے کہ "اسلامی اصول" کے مطابق جہاز رانی کا بیمہ شروع کیا تھا۔

۵- ساتویں صدی ہجری کی بات سمجھ میں نہیں آئی، شامی کی وفات تو ۱۲۵۲ھ میں ہوئی، لہذا تیرہویں صدی لکھنا چاہئے۔ شامی کی عبارت سے ان کے زمانہ کا رواج تو معلوم ہوا، مگر اس سے اپنے مسلمانوں کے رواج پر کوئی روشنی نہیں پڑتی۔

۶- کمیونزم ہو یا کوئی دوسرا ازم، اسلامی زندگی سے آنکھ ملانے کی تاب تو لا ہی نہیں سکتا، اس کا تاروپود کیا بکھیرے گا! یہ صحیح ہے کہ ایک طرف کمیونزم دوسری طرف سرمایہ دارانہ نظام، دونوں وقت کے بہت بڑے فتنے ہیں۔ کیا ان فتنوں کی وجہ سے دارالاسلام اور دارالحرب کی بحث طاق نسیاں کا نقش ونگار بن جائے گی؟ کیا ان فتنوں کے وقت میں کسی ملک پر دارالاسلام کی تعریف صادق آتی ہے اور کسی پر دارالحرب کی، تو ایک میں دارالاسلام اور دوسری میں دارالحرب کے احکام جاری نہ ہوں گے؟ کیا اسلامی نقطۂ نظر سے یہ تقسیم صحیح اور دونوں کے احکام مختلف نہیں ہیں؟ میرے نزدیک تو اس بحث سے اغماض اور گریز محض اس مرعوبیت کا نتیجہ ہے، جو موجودہ دور کی جمہوریت کے غلط پروپیگنڈے اور تمام نظاموں اور جمہوریتوں کی مساوات کے اعتقاد سے پیدا ہوگئی ہے۔ موجودہ دور میں اس کا فیصلہ تو دشوار ہوسکتا ہے کہ کون ملک دارالاسلام اور کون سا دارالحرب ہے، لیکن اس کا فیصلہ ہو جانے پر کسی مسئلہ کا فیصلہ بالکل دشوار نہیں ہے۔ شامی کی عبارت سے جن باتوں کا اندیشہ پیدا ہوتا ہے، ان کی وضاحت کے بعد ان پر مفصل بحث ہوسکتی ہے۔

۷- دارالاسلام و دارالحرب کی بحث کو حل کی بنیاد بنانا مناسب ہو یا نہ ہو،

سوال یہ ہے کہ بیمہ اگر ربوی معاملہ یا قمار ہے، تو دونوں جگہ اس کا حکم یکساں ہے یا الگ الگ؟

۸- علامہ محمد بخیت کی بحث کا جواب صحیح نہیں ہے، اس لیے کہ علامہ جس مال کے ہلاک بلا تعدٍ من شركة التامين کا ذکر کر رہے ہیں، اس سے مراد وہ دکان و مکان یا جائداد ہے، جس کا بیمہ کرایا جاتا ہے، اور کہتے ہیں کہ جب کمپنی پر شرائط کفالت منطبق نہیں ہیں، اور نہ وہ جائداد کمپنی کی تعدّی کی وجہ سے ہلاک ہوئی ہے، تو اس کی بربادی کا تاوان وہ کیوں برداشت کرے گی؟ اس کے جواب میں یہ کہہ رہے ہیں کہ کمپنی اس رقم کی امین ہے، جس کے عوض میں بیمہ ہوتا ہے اور جو قسط وار ادا کی جاتی ہے، اور کمپنی اس کو دوسرے مال سے خلط کر دیتی ہے، لہذا وہ ضامن ہے۔ آپ کی یہ بات بلا ردّ و قدح تسلیم کر لی جائے تو بھی اس سے کمپنی کے ذمہ قسط وار ادا کردہ رقم کا تاوان یا ضمان کا وجوب ثابت ہوگا، جس کی کمپنی امین ہے، مگر اس تقریر سے دوکان یا مکان برباد ہو جائے، تو اس کے تاوان کا وجوب کیونکر ثابت ہوتا ہے؟ اور بحث اسی میں ہے نہ اُس میں۔

۹- علامہ موسیٰ جار اللہ کی تقریر خطابی ہے یا بلفظ دیگر بالکل پُر فریب، کوئی ایسا کام جو کسی شرعی دلیل سے حرام یا ناجائز قرار پاتا ہو، تو وہ نصیحت یا رعایت کے عمومی حکم کی بنا پر جائز نہیں ہوسکتا، یا بلفظ دیگر کسی ناجائز کام میں مسلمانوں یا انسانوں کی چاہے جتنی بھی خیر خواہی ہو، درحقیقت وہ خیر خواہی نہیں، اور اس لیبل کی بنا پر وہ جائز نہیں ہو سکتی: ہمارے پاس عمدہ کھجوریں ہیں اور ضرورت سے زیادہ بھی نہیں کہ ہم کو تجارت مقصود ہو، مگر ایک شخص جس کے پاس ناقص کھجوریں ہیں، اس کی اور اس کے اہل و عیال کی انتہائی خواہش ہے کہ ذرا ہم بھی عمدہ کھجوریں کھا لیتے، پیسے بھی نہیں ہیں کہ پیسوں سے خرید لیں، ایسی حالت میں ہم از راہ خیر خواہی (مگر اس طرح کہ ہم کو بھی

خسارہ نہ ہو) دو سیر ردی کھجوروں کے عوض ایک سیر عمدہ کھجوریں اس کو دینا چاہیں تو نہیں دے سکتے، اس لیے کہ شرعاً ایسا کرنا جائز نہیں ہے۔

دوسرے نصیحت ورعایت پر بیمہ کی بنیاد نہ ہونے کا ناقابلِ تردید ثبوت یہ ہے کہ جب بیمہ دار ایک دو قسطیں ادا کرنے کے بعد بند کر دیتا ہے، تو ادا کردہ قسطوں کی رقم اس کو واپس نہیں دی جاتی، حالانکہ اگر بیمہ کی بنیاد نصیحت پر ہوتی، تو اس بیمہ دار کی اس رقم کو روکنا کسی طرح جائز نہ ہوتا۔ یہ کتنا بڑا اضلال فہم یا گمراہ کن مغالطہ ہے کہ بعض صورتوں میں کمپنی بیمہ دار کی اصل رقم ہی ہضم کر جائے، اور ہمیشہ اس کا سود یا نفع بھی کھاتی رہے تو غیر ناصح یا ناجائز نفع اندوز نہ قرار پائے؛ اسی طرح ننانوے فی صدی صورتوں میں بیمہ داروں کی رقم کا زیادہ تر منافع خود لے اور کم بیمہ دار کو دے، تب بھی وہ غیر ناصح نہ ہو، اور سو میں ایک بیمہ دار قسطوں کی ادائیگی کے درمیان مر جائے اور بیمہ کی رقم قانونی مجبوری کی وجہ سے کمپنی کو دینا پڑے، تو کمپنی ایسی ناصح قرار پا جائے کہ اس کی اس خالص کاروباری اور نفع اندوزی کی اسکیم کو صرف نصیحت ورعایت پر مبنی کہہ دیا جائے۔

١٠- علامہ موسیٰ جار اللہ نے بیمہ کی تیسری بنیاد کفالت کو قرار دیا ہے، اور معاشرہ کے ہر فرد کو دوسرے کی اصلاح ونفع رسانی کا کفیل ٹھہرایا ہے، اور فرمایا ہے کہ معاشرتی کفالت کو اسلام نے نہایت اونچے پیمانہ پر رواج دینے کی کوشش کی ہے۔ اس پر ہمارا سوال یہ ہے کہ اگر بیمہ کی بنیاد کفالتِ عام پر ہے، تو بیمہ کمپنی کو ہر شخص کے نقصان کی تلافی کرنی چاہئے خواہ وہ بیمہ دار ہو یا نہ ہو؛ اور اگر کفالتِ خاص پر ہے، تو ظاہر ہے کہ کفالت سے ان کی مراد فقہی کفالت نہیں ہو سکتی ہے، اس لیے کہ اس کی تعریف یہاں صادق نہیں آتی، بلکہ ان کی مراد پرورش، مدد، کسی چیز کی رضا کارانہ ذمہ داری لے لینا ہے، تو یہ چیز یہاں مفقود ہے، اس لیے کہ کمپنی جب تک بیمہ دار سے

ایک مقررہ رقم کی بالاقساط ادائیگی کا معاہدہ نہ کرالے اور بیمہ دار اس کی کوئی قسط ادا نہ کر لے، اس وقت تک مدد دینے یا تاوان برداشت کرنے کے لیے تیار نہیں ہوتی، لہذا یہ سودے بازی ہوئی تکافل یا تعاون نہیں ہے۔ جاہلیت میں یا اس کے بعد اسلام میں جو تعاون و تکافل رائج تھا، یا اسلام نے اس کو پھیلایا ہے، وہ تعاون نہیں جو روپیہ لے کر کیا جائے، بلکہ یا تو بالکل بلا معاوضہ، یا زیادہ سے زیادہ یہ کہ تمھارے اوپر وقت آئے گا تو ہم مدد کریں گے یا کفالت کریں گے، اور ہمارے اوپر وقت آئے گا تو تم کفالت کرو گے۔ اس طرح کے تکافل کو بیمہ پر منطبق کرنا بہت بڑا مغالطہ ہے۔

موسیٰ جار اللہ نے بیمہ کے سود، اور برباد شدہ دوکان و مکان کے تاوان کو جائز بنانے کے لیے جو تقریر کی ہے، وہ پوری کی پوری ناواقفیت یا تجاہل پر مبنی ہے، میں موسیٰ جار اللہ کے وکیلوں سے پوچھنا چاہتا ہوں کہ آپ کی تحقیق میں تلافی نقصان کی ذمہ داری کس کے سر ہوتی ہے اور اس کا معاہدہ کس سے ہوتا ہے؟ بیمہ داروں سے یا کمپنی کے شیرروں سے؟ یا دونوں سے؟ اگر آپ پہلی صورت اختیار کرتے ہیں تو یہ بدیہی البطلان ہے، اس لیے کہ ایک بیمہ دار کو تو خبر بھی نہیں ہوتی کہ کمپنی میں کس کس نے کس کس چیز کا بیمہ کرایا، پھر بیمہ دار کے تلافیٔ نقصان کی ذمہ داری لینا یا اس کا معاہدہ کرنا یعنی چہ؟ اور اگر آپ دوسری صورت اختیار کرتے ہیں تو اس صورت میں صرف شیرروں کے منافع یا اصل رقم سے تلافی کی رقم دی جانی چاہیے، مگر جہاں تک میں جانتا ہوں ایسا نہیں ہے۔ اور اگر تیسری صورت اختیار کی جائے تو اس پر بھی وہی اعتراض ہے جو پہلی پر ہے کہ بیمہ دار تلافیٔ نقصان کے ذمہ دار کس طرح قرار دیے جائیں گے، جب انھیں بیمہ کرانے والوں کا علم بھی نہیں ہوتا ان کے نقصان کے تلافی کا ذمہ لینا یا باہم ایسا معاہدہ ہونا تو بہت دور کی بات ہے۔

اس کے بعد موسیٰ جار اللہ نے بیمہ کی رقم کے سود کو حلال قرار دینے کے لیے

جو تقریر کی ہے وہ حد درجہ مبہم، بودی اور غیر علمی ہے۔ فرماتے ہیں کہ ''کمپنی نے بیمہ کی رقم کو نافع امور یا تجارت میں لگایا ہے تو تجارت، مضاربت؛ اور منافع، منافعِ مضاربت ہیں''۔ میں کہتا ہوں کہ یہ تو ایک صورت کی توجیہ ہوئی، دوسری صورت ''نافع امور'' میں لگانے کی جو ہے، اس کے منافع کیا کہلائیں گے؟ میرے نزدیک حقیقت یہ ہے کہ بات کسی طرح بنتی نہیں تو مجوزین گول مول بات، ناقص اور ناصاف بات کہہ کر مغالطہ دینے کی کوشش کرتے ہیں۔ مجھ سے صاف صاف سنئے! بیمہ کمپنی کبھی تو بیمہ کی رقموں کو کسی تجارت میں لگاتی ہے، کبھی ان رقموں سے بڑی بڑی بلڈنگیں خرید لیتی ہے اور ان کو کرایہ پر دیتی ہے، اور کبھی گورنمنٹ وغیرہ کو سودی قرضہ میں دیتی ہے۔ موسیٰ جار اللہ کی بات اگر کسی درجہ میں واقعیت کی حامل ہو تو صرف پہلی صورت میں ہوسکتی ہے، لیکن دوسری اور تیسری صورت میں ان کی بات بالکل نہیں چل سکتی؛ دوسری صورت میں رقم کا منافع بلڈنگوں کا کرایہ ہے، جس کو جائز ہونا چاہئے، مگر اس کے ساتھ ہر بیمہ دار کو اس بلڈنگ کی ملکیت میں شریک بھی ہونا چاہئے، اس لیے کہ وہ بلڈنگ اس کے روپئے سے بھی خریدی گئی ہے، لیکن بیمہ دار بلڈنگ کی ملکیت میں قطعاً شریک نہیں مانا جاتا، لہٰذا اس کی صورت اس کے سوا اور کوئی نہیں ہوسکتی کہ شیرر یہ قرار دیے ہوں گے کہ ہم نے بیمہ دار کی رقم بطور قرض حاصل کر کے خود بلڈنگ خریدی ہے، لہٰذا مالک ہم ہیں اور بیمہ دار صرف قرض کی رقم واپس لینے کا حق دار ہے، اس صورت میں جو منافع اس پر ملتا ہے، وہ منافعِ قرض ہے جو ربوا ہے: **كل قرضٍ جَرَّ منفعةً فهو ربواً** اور بعینہ یہی حکم تیسری صورت کا بھی ہے۔ اب آپ غور کیجئے کہ موسیٰ جار اللہ صاحب نے ان دونوں صورتوں سے قطعاً تعرض نہیں کیا؛ اگر یہ بات ان کے علم میں نہیں تھی، تو بہت بڑی ناواقفیت ہے؛ اور اگر علم میں تھی، تو بڑی بددیانتی کی بات ہے کہ صرف ایک صورت جس سے جواز نکلنے کا امکان ہے، اس سے تو تعرض کیا جائے، اور

اس کے مقابل کم از کم دو صورتیں جن سے عدم جواز کا پہلو پیدا ہوتا ہے، اس سے اغماض کرلیا جائے۔

اس کے بعد ان کی پہلی صورت کو لیجئے۔ موسیٰ جار اللہ بیمہ کی رقم کو تجارت میں لگانے کو مضاربت کہتے ہیں، لیکن کیا وہ یہ نہیں جانتے کہ مضاربت ایک شرعی عقد ہے، اس کی ایک حقیقت ہے، اس کے ارکان اور شرائط ہیں، نیز اس کے احکام ہیں؛ اگر اس شرعی عقد کے ارکان اور اس کے شرائط ہماری صورت میں پائے جاتے ہیں، تو وہ بے شک مضاربت ہے؛ اور اگر ایسا نہیں ہے، تو مضاربت کہنا مغالطہ دہی ہے؛ پھر اگر وجودِ ارکان و تحققِ شرائط کی وجہ سے ہماری صورت میں مضاربت متحقق ہوگی، تو اپنے تمام احکام و لوازم کے ساتھ متحقق ہوگی۔ افسوس ہے کہ موسیٰ جار اللہ نے اس تفصیل کے ساتھ اس پر بالکل نظر نہیں ڈالی! بس ذرا سی مشابہت صوری کی بنا پر اس کو مضاربت کہہ کر جواز کا فتویٰ صادر فرما دیا۔

اس اجمال کی تھوڑی سی تفصیل یہ ہے کہ بیمہ میں جو معاہدہ ہوتا ہے، وہ نہ لفظ کے اعتبار سے مضاربت ہے، نہ معنی کے لحاظ سے؛ لفظ کے اعتبار سے نہ ہونا تو ظاہر ہے، اور معنی کے لحاظ سے اس لیے نہیں ہے کہ متعاقدین میں سے کوئی بھی مضاربت کا ارادہ کر کے معاہدہ نہیں کرتا، نہ ان میں سے کسی کو اس کا شعور و احساس ہوتا ہے کہ ہمارے اس معاملہ پر مضاربت کے آثار مرتب ہوں گے، اور نہ فعلاً وہ آثار مرتب ہی ہوتے ہیں۔

بیمہ کے مضاربت نہ ہونے کا ایک ثبوت یہ بھی ہے کہ بیمہ کی رقم سے جو تجارت ہوتی ہے، اس کا بیمہ دار کو نہ علم ہوتا ہے، اور نہ اس کو اس میں کسی قسم کے اعتراض اور روک ٹوک یا حساب فہمی وغیرہ کا کوئی اختیار ہوتا ہے؛ درانحالیکہ مضاربت میں جو کام رب المال کی مرضی اور عادت تجار کے خلاف ہو، اس پر اس کو حق اعتراض

حاصل ہوتا ہے، اسی طرح اس کو یہ حق بھی حاصل ہے کہ مُضارِب سے حساب فہمی کر کے اطمینان کرے کہ اس کو نفع کی جو مقدار طے ہوئی ہے، وہی مل رہی ہے یا کم وبیش۔

مُضارَبَت میں یہ شرط ہے کہ عقد کے اندر یہ طے ہو جائے کہ رب المال اور مضارِب کا نفع کتنا کتنا ہوگا، ہر ایک کا نصف نصف ہوگا، یا ایک کا ایک ثلث اور دوسرے کا دو ثلث، یا کسی تیسری شکل سے؛ بیمہ میں یہ بات بھی نہیں پائی جاتی۔ اسی طرح کتبِ فقہ سامنے رکھ کر بیمہ کے معاملہ پر غور کیجئے، تو بیمہ پر مضاربت کسی طرح منطبق نہیں ہوتی۔

اس کے علاوہ بیمہ میں صرف اتنا تو ہوتا نہیں کہ بیمہ دار روپیہ دیتا ہے اور کمپنی اس کو نفع دیتی ہے، بلکہ عین اسی معاہدہ میں کمپنی اس کی ذمہ داری بھی لیتی ہے کہ اگر مدت مقررہ کے اندر وہ مر گیا، یا اس کی دوکان کو آگ لگ گئی، تو کمپنی اس نقصان کی تلافی کرے گی۔ ظاہر ہے کہ یہ دو معاہدے ہیں اور دونوں ایک دوسرے سے الگ نہیں بلکہ باہم وابستہ ہیں۔ جار اللہ صاحب کو لازم تھا کہ اس کو بھی سامنے رکھ کر سوچتے کہ مضاربت میں اس طرح کی باتِ کہاں تک جائز ہے۔ بدایۃ المجتہد میں ہے: **هذا هو الأصل عند مالك في أن لا يكون مع القراض بيع، و لا كراء، و لا سلف، و لا عمل، و لا مرفق يشترطه أحدهما لصاحبه مع نفسه، فهذه جملة ما اتفقوا عليه (۲۲۴/۲)**

بہر حال یہ بحث اگرچہ اس سے زیادہ طول طلب ہے، مگر زیادہ شرح وبسط کا نہ موقع ہے نہ فرصت۔

موسیٰ جار اللہ صاحب کی یہ محض خوش فہمی ہے کہ جان یا مال کے تلافیٔ نقصان کو "عون" سمجھ رہے ہیں، اور عون کے خوبصورت لفظ کی بنیاد پر اس کو جائز سمجھتے یا بتاتے ہیں۔

سوچنے کی بات ہے کہ موسیٰ جار اللہ صاحب ''عون'' کے جس وسیع مفہوم کو سامنے رکھ کر بات کر رہے ہیں، اس مفہوم کی رو سے ہر تجارت، ہر اجارہ، ہر ملازمت، اور سارے کاروبار ''عون وتعاون'' میں داخل ہیں، حتیٰ کہ کوئی ربوی معاملہ اور کوئی عقد فاسد بھی تعاون سے خالی نہیں ہے، تو ان سب کو عون کہہ کر جواز کا فتویٰ دے دیا جائے گا؟ تعاون عرفِ عام میں بلا معاوضہ اور متبرعانہ مدد وامداد کے معنیٰ میں بولا جاتا ہے، پس وہ اگر تعاون علی البر ہے تو جائز، اور اگر تعاون علی الاثم ہے تو ناجائز! باقی رہی تعاون کی وہ ایک شکل جو ان معاملات وعقود میں پائی جاتی ہے، جن میں مبادلہ ہوتا ہے، تو اس پر کسی عقد کے جواز کی بنیاد رکھنا غلط ہے؛ عقود کے جواز وعدمِ جواز کا مدار اس مبادلہ کی صحت وعدمِ صحت پر ہے، جو اس عقد میں پایا جاتا ہے۔

بیمہ کے مضاربت نہ ہونے کے کچھ دلائل الاستاذ محمد البناء کی تقریر میں مذکور ہیں۔

۱۱- الاستاذ عبدالوہاب نے بیمہ کو جس بنیاد پر جائز قرار دینے کی کوشش کی ہے، وہ بنیاد بھی صحیح نہیں ہے۔ سب سے پہلے تو شرعی نقطۂ نظر سے منفعت اور مضرت کی تعیین ضروری ہے، اس کے بعد یہ دیکھنا بھی ضروری ہے کہ جس معاملہ میں نفع کا غلبہ ہے، اس میں کوئی بات نصوص یا اصول مسلمۂ شریعت سے متصادم تو نہیں ہے، پس جہاں بیمہ میں غلبۂ نفع پر دھیان دیا گیا تھا، وہاں یہ بھی سوچنا چاہئے تھا کہ کسی کو کوئی رقم دینے کی عقلاً وشرعاً چند صورتیں ہیں: ایک یہ کہ وہ رقم کسی مال کے بدلہ میں دی جائے، تو یہ صورت بیع یا ہبہ بالعوض کی ہے؛ دوسری یہ کہ کسی منفعت کا معاوضہ ہو، تو یہ اجارہ ہے؛ تیسری یہ کہ بلا کسی معاوضہ کے دی جائے، اور جس کو دی جائے اس کو اس کا مالک بنا دیا جائے، یہ ہبہ یا تصدق ہے؛ چوتھی یہ کہ بلا معاوضہ دی جائے اور مالک نہ بنایا جائے، تو اس میں شقیں ہیں:

(۱) یہ کہ جس کو دی گئی ہے اس کو اس میں تصرف کا حق نہ ہو، تو وہ ودیعہ ہے۔

(۲) یہ کہ اس کو تصرف کا حق ہو اور اس تصرف سے جو منفعت حاصل ہو، اس میں رقم دینے والے اور لینے والے دونوں کا حصہ ہو، تو یہ مضاربت ہے۔

(۳) یہ کہ اس کو تصرف کا حق حاصل [ہو] اور تصرف سے جو منفعت حاصل ہو اس کا حق دار صرف رقم لینے والا ہو، تو یہ قرض ہے۔

ان صورتوں کے علاوہ عقلاً کوئی اور صورت کسی کو کوئی رقم دینے کی نہیں معلوم ہوتی۔ اب بیمہ میں جو رقم دی جاتی ہے، اس پر غور کیا جاتا ہے تو اس پر آخری تینوں صورتیں بظاہر منطبق ہوتی نظر آرہی ہیں؛ مگر اوپر ثابت کیا جاچکا کہ بیمہ مضاربت نہیں ہے، لہٰذا اب باقیماندہ دو صورتوں کے جو احکام شریعت میں ہیں، وہ بیمہ پر ضرور نافذ ہوں گے۔

اب رہا یہ شبہ کہ بیمہ مجرد رقم دینے کا ہی نام نہیں، بلکہ وہ چند امور سے مرکب ہے، یا اس کے ساتھ چند چیزیں دوسری بھی ملی ہوئی ہیں، تو گزارش ہے کہ یہ صحیح ہے، لیکن اس کی وجہ سے دفع مبلغ (رقم کا دینا) ایداع یا اقراض سے خارج نہ ہو جائے گا، جس طرح کہ کوئی شخص دس روپے کا گندم خرید لے اور بائع سے شرط کرے کہ اس کو ہمارے گھر تک پہنچا بھی دو، تو یہ معاملہ دو چیزوں سے مرکب ہونے کی وجہ سے بیع سے خارج نہیں ہوگا۔

اس کے علاوہ ایک چیز اور بھی قابلِ توجہ ہے، وہ یہ کہ زندگی کے بیمہ کو عربی میں التامین علی الحیاۃ، انگریزی میں لائف انشورنس اور اردو میں پہلے جان کا بیمہ کہا جاتا تھا، اب زندگی کا بیمہ کہا جاتا ہے؛ بیمہ کے یہ نام صراحۃً دلالت کرتے ہیں کہ بیمہ کی اصل وضع زندگی کا ضمان لینے ہی کے لیے ہے، لہٰذا اس کا شرعی حکم معلوم

کرنے کے لیے اس بات کو سامنے رکھ کر غور کرنا چاہئے کہ یہ معاملہ زندگی کے ضمان کا ہے؛ مگر ہمارے علماء اس کو جائز بنانے کے چکر میں اس کی اصل وضع کو بالکل نظر انداز کر کے زبردستی دوسرے ابواب پر منطبق کرنے کی سعی لا حاصل کرتے ہیں۔

۱۲- مستقبل کی ضمانت تو نہ کسی کے علم میں ہے نہ مقدور، اس لیے مستقبل کی ضمانت کا عنوان غیر شرعی ہونے کے ساتھ غیر منطقی بھی ہے؛ ہاں خطرات سے حفاظت کا جذبہ انسان کی فطرت میں ودیعت ہے، یہ مسلّم ہے، اور یہ بھی مسلّم ہے کہ انسان اپنی حفاظت کے لیے پیش بندی کے طور بہت سے انتظامات کرتا ہے، لیکن وہ سارے انتظامات ایسے ہوتے ہیں کہ ان میں اور حفاظت میں ایک معقول ربط ہوتا ہے، انتظام سبب اور حفاظت مسبَّب ہوتی ہے، مثلاً وبا کے زمانہ میں مکان وغیرہ کا صاف ستھرا رکھنا، جراثیم کُش دواؤں کا چھڑکنا، اور اسی طرح کی دواؤں اور غذاؤں کا استعمال، یا وبا کے مریضوں سے اختلاط سے پرہیز وغیرہ۔ لیکن بیمہ اور حفاظت میں کوئی عقلی و منطقی ربط نہیں ہے، نہ بیمہ کا مقصود درحقیقت حفاظت کا تحقق ہے، بلکہ بیمہ تو درحقیقت حفاظت کی ایک بے دلیل پیشین گوئی ہے، جو اگر سچی ہوگئی تو کمپنی تاوان دینے سے بچ جائے گی، اور جھوٹی نکلی تو بیمہ کمپنی کو تاوان ادا کرنا پڑے گا۔ علماء کرام کو سوچنا چاہئے کہ بیمہ کوئی ایسی چیز نہیں ہے، جو کم از کم سبب ہی کے درجہ میں سہی انسان کو کسی خطرہ سے بچانے میں مؤثر ہو، اور جب ایسا ہے تو اس کو حفاظت کا انتظام قرار دینا نہایت عجیب بات ہے۔

حفاظت کا جذبہ بے شک فطری ہے، اور انتظامِ حفاظت کے جتنے فطری طریقے ہیں وہ ہمیشہ سے رائج ہیں؛ اور بیمہ چونکہ بالکل غیر فطری طریقہ ہے، اس لیے ابتداء آفرینش سے لے کر اب سے چند سال پہلے تک جو بہت ہی طویل مدت ہے، فطرت نے اس کی طرف کبھی رہنمائی نہیں کی، مدتہائے دراز کے بعد جب فطرتِ

سلیمہ مسخ ہوگئی، تو ''حفاظت کا یہ نیا طریقہ'' ایجاد ہوا۔

۱۳- مجھے قدیم و جدید حالات کا گہری نظر سے مطالعہ کرنے کا دعویٰ نہیں ہے، لیکن مجھے اس بات کے تسلیم کرنے میں بہت تأمل ہے کہ عقود و معاملات کی قدیم شکلیں موجودہ بلکہ آئندہ پیدا ہونے والی تمام ضرورتوں کے لیے کافی نہیں ہیں، میرا یقین یہ ہے کہ جہاں تک ضروریاتِ زندگی کا تعلق ہے قدیم عقود سے پوری ہو جاتی ہیں؛ اب رہے نئے عقود و معاملات تو وہ ضروریاتِ زندگی کے تقاضے سے پیدا نہیں ہوئے ہیں، بلکہ زر اندوزی کی لامحدود حرص کی بنا پر سرمایہ داری کی حفاظت کے لیے ایجاد کیے گئے ہیں؛ اور اگر قدیم عقود کو ضروریاتِ زندگی کے لیے ناکافی مان کر جدید عقود کی ضرورت تسلیم بھی کر لی جائے، تو یہ تسلیم کرنا قطعاً ضروری نہیں ہے کہ چونکہ یہ عقود نئے ہیں، اس لیے پرانے عقود سے ان کے جواز و عدمِ جواز پر کوئی روشنی نہیں پڑ سکتی، یا ہر نیا عقد کسی نہ کسی پرانے عقد کی نظیر نہیں ہے، مثلاً بیع بالوفا کو نیا عقد قرار دیا گیا ہے، مگر وہ عقد یا تو بیع کے ماتحت ہے یا رہن کے، جیسا کہ فقہا کی ان عبارات سے ظاہر ہے جو اس سلسلے میں نقل کی گئی ہیں۔

شریعتِ اسلامیہ ایک جامع اور مکمل شریعت ہے، اس لیے قیامت تک جتنے حوادث و نوازل پیش آئیں گے، ان کے احکام اس شریعت میں ضرور موجود ہوں گے، جزئیات کے غیر محصور ہونے کی وجہ سے ان کا احاطہ تو ہو نہیں سکتا، مگر قواعد و اصول کے ضمن میں ہر ہر جزئی کا حکم شریعت میں پایا جانا ضروری ہے؛ اس لیے میرے نزدیک تو یہ بحث ہی فضول ہے کہ بیمہ وغیرہ قدیم عقود کے تحت آتے ہیں یا نہیں آتے، ہر حال میں قواعد شرعیہ کے رُو سے اس کا کوئی شرعی حکم ضرور ہوگا۔ یہ کہنا تو میرے نزدیک شریعت کی جامعیت پر ضرب لگانا، یا ایک بہت بڑے خطرے کو مول لینا ہے، کہ بیمہ بالکل ایک نیا عقد ہے، وہ قواعد و اصولِ شریعت کی گرفت سے بالکل باہر ہے، کسی

اصل شرعی سے نہ اس کے جواز پر روشنی پڑتی ہے، نہ عدم جواز پر۔

مضمون میں اس کے بعد بیمہ کے مسئلہ کو حل کرنے کے لیے کچھ اور بنیادیں بھی ذکر کی گئی ہیں، لیکن چونکہ واضح اور متعین طور پر یہ نہیں بتایا گیا ہے، کہ ان بنیادوں پر بیمہ کا جواز کس طرح نکلتا ہے، اس لیے سرِ دست ان پر کوئی تبصرہ قبل از وقت ہے، مگر اتنا تو ابھی عرض کر دینا ضروری ہے کہ ان بنیادوں کے بیان میں بڑا ابہام و اجمال ہے، جس سے بہت سی غلط فہمیاں پیدا ہو سکتی ہیں۔ آئندہ ان بنیادوں کو بہت محتاط لفظوں میں بیان کرنے اور مثالوں سے ان کو واضح کرنے کی ضرورت ہے، تاکہ اباحی رجحانات کے لیے یہ بنیادیں سند کا کام نہ دیں۔

۱۴- حادثاتی بیمہ اور نظامِ عاقلہ میں مشابہت دکھانے کے لیے نظامِ عاقلہ کا تعارف جن لفظوں میں کرایا گیا ہے، وہ بہت زیادہ محلِ نظر ہے۔ ان الفاظ سے تو یہ معلوم ہوتا ہے کہ تعاون و تناصر کے لیے ایک نظام بنام عاقلہ بنایا گیا تھا، حالانکہ حقیقت یہ ہے کہ عرب جاہلیت میں چونکہ یہ دستور تھا کہ ایک قبیلہ کا کوئی فرد کسی مشکل یا مصیبت میں پھنس جاتا، تو اس کے عصبات (بھائی، بھتیجے اور چچا وغیرہ) اس کی مدد کے لیے کھڑے ہو جاتے تھے (کتبِ فقہ میں اسی کو تناصر سے تعبیر کیا گیا ہے، دیکھو شامی ۵/ ۴۲۷) اس تناصر کی بنا پر ان میں یہ دستور بھی تھا کہ قبیلہ کا کوئی آدمی کسی کو قتل کر دے اور دیت پر بات آ ٹھہرے، تو قاتل کے بھائی، بھتیجے وغیرہ اور دوسرے عصبات کو مذکورہ بالا تناصر کی وجہ سے اداء دیت میں شریک کیا جاتا تھا، پھر جب اسلام آیا تو اس نے بھی اس دستور کو باقی رکھا، اور قتلِ خطا وغیرہ کی دیت کو عصبات پر واجب و لازم قرار دیا، مجرم کے ساتھ غیر مجرموں پر دیت واجب کرنے کی بنیاد وہی تناصر ہے، جو مجرم اور اس کے عصبات میں پایا جاتا ہے۔ اس تقریر سے ایک بات تو یہ معلوم ہوئی کہ عاقلہ پر ایجابِ دیت کی بنیاد یا علّت ان کا مجرموں کے ساتھ تناصر ہے، نہ یہ کہ

نظامِ عاقلہ کا قیام تناصر کے لیے ہوا ہے۔

دوسری بات یہ معلوم ہوئی کہ عاقل چاہے عصبات ہوں یا اہلِ دیوان یا اہلِ حرفہ، ان کا کوئی آدمی قتلِ خطا کا (مثلاً) مرتکب ہوگا، تو اس قتل کی دیت کا لزوم ان کی مرضی پر اور آپس کے معاہدہ پر موقوف نہیں ہے، بلکہ وہ ان پر بایجاب الشرع واجب ہے، وہ چاہیں یا نہ چاہیں، اور باہم کوئی معاہدہ کریں یا نہ کریں؛ برخلاف بیمہ کے کہ اگر اس میں اس طرح کی کوئی چیز پائی بھی جاتی ہو تو وہ محض معاہدہ کی پابندی کی وجہ سے ہے، اور اسی سے یہ بات بھی واضح ہوتی ہے کہ نظامِ عاقلہ کا قیام اس لیے نہیں ہے کہ ان کے کسی آدمی کو کوئی حادثہ پیش آئے گا، تو عاقلہ بھی مل جل کر اس کی تلافی کریں گے، بلکہ اس کا مقصد یہ ہے کہ ان کا کوئی آدمی کسی حادثہ یا جرم کا مرتکب ہوگا اور اس کی وجہ سے اس پر جرمانہ عائد ہوگا، تو عاقلہ بھی اس جرمانہ کی ادائیگی میں شریک کیے جائیں گے، اس لیے کہ اگر عاقلہ مجرم پر کڑی نگرانی رکھتے، تو وہ ارتکابِ جرم نہ کرتا۔ اس وضاحت کے بعد بیمہ کی اس نظام سے کیا مشابہت باقی رہتی ہے، اور یہیں سے یہ بات بھی کھل جاتی ہے کہ نظامِ عاقلہ کو حادثات وخطرات کی تلافی کے لیے امدادِ باہمی کہنا صریح مغالطہ ہے۔

اس کے بعد یہ بھی سن لیجئے کہ کوئی آدمی اگر کسی کے گھر میں آگ لگا دے، یا اس کا مال چرا لے، تو اس کا تاوان صرف مجرم پر واجب ہے، عاقلہ میں سے کسی پر قطعاً واجب نہیں؛ اس لیے یہ بات صحیح نہیں ہے کہ مختلف حادثات کے وقت اس قسم کے نظام کو بروئے کار لانے کی عمومیت ثابت ہوتی ہے، اور اس کے ثبوت میں شامی کی جو عبارت پیش کی گئی ہے وہ مفیدِ مدعا نہیں ہے، اس لیے کہ اس میں اس کے سوا اور کچھ مذکور نہیں ہے کہ ''کسی کے یہاں چوری وغیرہ ہو جائے تو اس کے نقصان کی تلافی کے لیے کچھ رقم جمع کرنے کی عادت لوگوں میں پائی جاتی ہے''۔ شامی یا کسی کتاب میں یہ

نہیں ہے کہ اس صورت میں عصبات یا اہلِ دیوان پر واجب ہے کہ اس کے نقصان کی تلافی کریں، برخلاف دیتِ قتلِ خطا کے کہ وہ واجب ہے۔

۱۵-قولہ: ''قوت و مدد حاصل ہوسکتی ہے تو حالات و تقاضہ کے لحاظ سے سب کی گنجائش ہے''۔ مبسوط کی عبارت کا یہ مفہوم نہیں ہے، بلکہ اس کا مفہوم یہ ہے کہ پہلے عشیرہ پر دیت واجب تھی، اس لیے کہ نصرت وقوت کا وجود ہم عشیرہ ہونے کی بنیاد پر تھا، جب حضرت عمرؓ نے دواوین مدون کیے، تو ایک دیوان میں جن لوگوں کا اندراج تھا ان میں باہم تناصر وتعاون ہوا کرتا تھا، یعنی ہم عشیرہ ہونے کے بجائے ہم دیوان ہونے کی بنیاد پر تناصر کا تحقق ہوا، لہذا انھوں نے بجائے عشیرہ کے اہلِ دیوان کو ادائے دیت کا ذمہ دار قرار دیا۔ اب اگر ایک حرفہ والے اپنے دوسرے ہم پیشہ لوگوں کے ساتھ تناصر کا بھی برتاؤ کرتے ہوں، تو ایک محترف کے جرم کی دیت اس کے ہم پیشہ لوگوں پر واجب کی جاسکتی ہے؛ حاصل یہ کہ وجوبِ دیت کا منٰی کسی بنیاد پر تناصر کا تحقق ہے امکان نہیں۔ اس کے بعد سنئے کہ بیمہ میں باہم بیمہ داروں یا شیرروں میں اس طرح کے تناصر کا کوئی وجود نہیں ہے کہ ایک پر کوئی آفت آئے تو دوسرا اس کی کفایت کے لیے کھڑا ہو جائے، یہ تو درکنار تعارف تک نہیں ہوتا؛ چنانچہ اگر اسلامی حکومت قائم ہو اور بیمہ داروں اور شیرروں میں سے کوئی قتلِ خطا کا مرتکب ہو، تو دیت کا کوئی حصہ بیمہ دار یا شیرر پر عائد نہیں ہوسکتا، بلکہ آج کے عرف کے مطابق اس کی برادری والوں پر دیت ہوگی، یا اس کے محلہ والوں پر۔

۱۶-قولہ: ''اسلام میں ایک ایسا نظام قائم کرنے کی الخ'' نظامِ عاقلہ اس مدعا کی دلیل قطعاً نہیں بنتا، اس لیے کہ اس کی بنیاد مالی نقصان یا حادثہ کی تلافی کے اوپر نہیں ہے۔

باقی اس سے قطعِ نظر کر کے اسلام میں بے شک ایسے نظام قائم کرنے کی

حوصلہ افزائی موجود ہے، جس کے ذریعہ مالی نقصان اور حادثہ کی تلافی کی جا سکے، لیکن اسلام میں کسی ایسے نظام کی قطعاً کوئی گنجائش نہیں ہے، جو ہوتو خالص ایک کاروباری نظام، جس کے قائم کرنے میں اصول وقواعدِ اسلام کی کوئی رعایت نہ کی گئی اور ملمع کاری کے ذریعہ اس کو ظاہر کیا جائے باہمی امداد اور تلافی نقصان کے روپ میں۔

بیمہ اگر واقعی تعاون وتلافیٔ نقصان کے لیے ہے اور اس کو نظامِ عاقلہ سے مشابہت ہے تو اس میں ادائیگیٔ رقم کی شرط کیسی؟ نظامِ عاقلہ میں کیا کوئی فنڈ اکٹھا کیا جاتا ہے؟ نظامِ عاقلہ کے مشابہ اگر تلافیٔ نقصان کے لیے نظام بنانا ہے، تو سو آدمیوں کی ایک انجمن بنا لیجیے، اور ایک معاہدہ کے ذریعہ طے کر لیجیے کہ ان میں سے کسی پر کوئی مصیبت آئے گی تو سب مل کر اس کی مدد کریں گے، مالی نقصان ہوگا تو چندہ کر کے اس نقصان کو پورا کریں گے، اور اپنے خیال کے مطابق اس کو منظّم کرنا ہے تو پہلے ہی ہر ممبر سے ایک مقرر رقم وصول کر کے کسی تجارت میں لگا دیجیے، اور تجارت کے منافع کو ممبروں کے مالی نقصان کے لیے وقف کر دیجیے۔ مگر مجھ کو یقین ہے کہ اس کے لیے کوئی آمادہ نہ ہوگا، اس لیے کہ اس میں کوئی دنیاوی منفعت نہیں ہے، حالانکہ تعاون کا مقصد پورے طور پر حاصل ہے۔ اس سے صاف ظاہر ہوگیا کہ بیمہ تعاون کے لیے نہیں کرایا جاتا بلکہ زراندوزی کے لیے کرایا جاتا ہے۔

بیمہ کی نسبت یہ کہنا کہ دراصل بیمہ دار ایک معینہ رقم ادا کر کے ایک معاہدہ میں شریک ہوتا ہے، جس میں پیش آنے والے خطرات کی تلافی کا بندوبست ہوتا ہے، نہ اس کو اپنی ادا کی ہوئی رقم سے استفادہ ملحوظ ہوتا ہے اور نہ رقم کی مقدار اور اس سے محرومی کا کوئی سوال ہوتا ہے، صرف حادثہ کے وقت امداد کی ضرورت پیشِ نظر ہوتی ہے اور اسی کو بنیاد بنا کر وہ اس نظام میں شریک ہوتا ہے (ص ۳۱)۔ بڑی بے باکانہ غلط بیانی اور مسخِ حقیقت ہے، اس لیے کہ اگر (صرف حادثہ کے وقت امداد کی ضرورت پیش

نظر ہوتی ہے) سے یہ مراد ہے کہ زید نے بیمہ صرف اس لیے کرایا کہ اگر عمرو کو حادثہ پیش آئے گا، تو میری رقم سے عمرو کی مدد اور اس کے نقصان کی تلافی ہو سکے گی، تو یہ ایسی خلافِ واقع بات ہے، جس کو ایک لمحہ کے لیے بھی کوئی واقف کار صحیح نہیں مان سکتا؛ ہاں اگر یہ مراد ہے کہ زید صرف اس لیے بیمہ کراتا ہے کہ زید کو خود کوئی مالی نقصان پہنچے گا، تو بیمہ کمپنی زید کے مالی نقصان کی تلافی کرے گی، تو یہ بے شک صحیح ہے، لیکن بیمہ کی بنیاد ''عون''، ''امداد باہمی'' اور خیر خواہی پر ہوئی، یا خود غرضی اور اپنے نفس کے لیے جلبِ منفعت پر؟ نیز ایسی حالت میں بیمہ نظامِ عاقلہ یا اسی طرح کے دوسرے کسی نظام کے مشابہ کیونکر ہوا؟

فاضل مضمون نگار سے سخت حیرت ہے کہ انھوں نے یہ لکھنے کی ہمت کیسے کی کہ ''حادثاتی بیمہ اسی قسم کا ایک نظام ہے جس کے ذریعہ بیمہ دار سے سالانہ ایک رقم وصول کی جاتی ہے اور حادثہ کے وقت ضروری مدد اور قوت پہنچانے کا بند و بست کرنا ہے''۔ اس لیے کہ بیمہ ایسی معمولی سی بات کا نام نہیں ہے، بلکہ اس عقد کے اندر ادا کردہ رقوم پر سود کا اضافہ ہونا، بعض صورتوں میں قسطوں کی ادائیگی بند کر دینے سے چند قسطوں کی رقموں کا سوخت ہو جانا، زندگی کے بیمہ میں اگر مدت معینہ کے اندر بیمہ دار مر گیا تو نامزد رقم کی ادائیگی کے بغیر ہی اس کا حقدار ہو جانا مشروط و مصرح ہوتا ہے، اور بیمہ دار صرف اپنے نفع و نقصان کے پیشِ نظر یہ سب کچھ کرتا ہے، اس کی نظر کے سامنے دوسرے کسی کی نہ مدد ہوتی ہے نہ تلافی نقصان؛ پس مجوزین کے لیے لازم ہے کہ ان کے زعم میں بیمہ کی جو علت غائی ہے (حالانکہ جس چیز کو وہ علت غائی بتا رہے ہیں وہ بھی صحیح نہیں) صرف اسی کو سامنے رکھ کر غور نہ کریں، بلکہ بیمہ کے اجزاء ترکیبی اور ان شرائط کو بھی سامنے رکھیں، جن کے بغیر یہ معاہدہ مکمل نہیں ہو سکتا۔ اگر اجزاء ترکیبی یا شرائط ناجائز ہیں، تو مقصد چاہے جتنا بھی پاکیزہ ہو یہ معاملہ جائز نہیں ہو سکتا،

زیادہ واضح لفظوں میں سنئے کہ اگر عقد میں ربا کی شرط ہے تو یہ بات نہیں ہے کہ عقد صحیح اور ربا ناجائز، بلکہ خود عقد ہی صحیح نہیں ہے، اسی طرح مجوزین کو چاہئے کہ خوبصورت لفظوں کو ان کے موقع اور محل میں استعمال کریں، بار بار امداد باہمی اور اجتماعی جرمانہ کے الفاظ کے دہرانے سے بیمہ امداد یا اجتماعی جرمانہ نہ ہو جائے گا، جب تک ہم کو نہ سمجھایئے کہ بیمہ کرانے والا اپنی موت اور اپنی دوکان کے نقصان کی تلافی کرانے کے لیے بیمہ کراتا ہے یا کسی دوسرے کی؟ ظاہر ہے کہ اپنے نفس کے سوا کسی دوسرے کا کوئی سوال نہیں ہے، پھر امداد باہمی کا استعمال یہاں بے معنی بات ہے، اسی طرح بیمہ داروں میں سے کوئی آگ لگاتا اور سب مل کر تاوان دیتے تو اجتماعی جرمانہ ایک بامعنی اور باموقع لفظ ہوتا، لیکن بیمہ داروں میں سے کسی نے کوئی جرم نہیں کیا، تو کمپنی سے بیمہ دار کو کسی نقصان کا جو معاوضہ ملتا ہے، اس کو ''اجتماعی جرمانہ'' کہنا بے معنی بات ہے۔ اور جب بیمہ والے تلافئ نقصان پر اجتماعی جرمانہ کی تعریف صادق نہیں آتی، تو اجتماعی جرمانہ کو جائز ثابت کرنے کے لیے قسامت کی جو بحث اٹھائی گئی ہے، وہ بھی بے محل اور بے تعلق ہے۔

اسی طرح شخصی بیمہ اور ذمہ داری کے بیمہ کو عقد موالاۃ پر قیاس کرنا صریح ظلم ہے، جب کہ خود ہی مبسوط سے یہ بھی نقل فرما رہے ہیں کہ عقد موالاۃ میں ہر ایک دوسرے کے حق میں تبرع کرتا ہے، اور بلا معاوضہ ایک جنایت کی دیت ادا کرتا ہے، اور دوسرا اپنے مال میں اس کے لیے حق وراثت کو تسلیم کرتا ہے؛ برخلاف بیمہ کے کہ وہ اتنا سخت عقد مبادلہ ہے کہ اگر طے شدہ رقم پوری پوری ادا نہ کی جائے، تو دو ایک قسطوں کی رقم کمپنی مفت ہڑپ کر لے گی، اور باہمی معاہدہ سے پہلے ایک لمبی رقم طے ہوتی ہے، جس کے بغیر کوئی معاہدہ وجود پذیر نہیں ہوتا، درصورتیکہ عقد موالاۃ میں کسی جانب سے بھی ایک پیسہ کے ادائیگی کی شرط بھی نہیں ہوتی۔ پھر اصل معاہدہ کی نوعیت میں

آسمان وزمین کا فرق ہے، بیمہ میں یہ معاہدہ ہوتا ہے کہ بیمہ دار اگر مدت کے اندر مر گیا اور وہ قسط وار رقم برابر ادا کرتا رہا ہے، تو کمپنی اس کے جان کا معاوضہ ادا کرے گی ،یعنی جو چیز قابلِ معاوضہ نہیں ہے محض اس ناجائز معاہدہ کی بنا پر اس کا بھی معاوضہ کمپنی کو دینا پڑے گا؛ برخلاف عقد موالاۃ کے کہ اس میں یہ معاہدہ ہوتا ہے کہ اگر مجھ سے غلطی ہوگئی اور میں نے قتلِ خطا کا ارتکاب مثلاً کرلیا تو تم دیت ادا کرنے میں میری مدد کرنا، اور میں مرجاؤں اور میرا کوئی قریب وارث نہ ہو تو تم ہی میرے وارث قرار پاؤ گے، ان دونوں معاہدوں میں موازنہ کرکے دیکھئے، ایک کو دوسرے سے کیا نسبت ہے، پہلے معاہدہ میں کوئی معقولیت نہیں ہے، برخلاف دوسرے کے کہ وہ نہایت معقول اور انسانی ہمدردی کا مظہر ہے۔

۱۷- کفالت کی جو تعریف نقل کی گئی ہے، وہ بیمہ پر صادق نہیں ہے، اس لیے کہ ضم ذمة الكفيل إلى ذمة الأصيل میں اصل سے مراد مدیون ہے، اور بیمہ میں ابھی کوئی مدیون متحقق ہی نہیں ہے، بیمہ دار کی موت کی صورت میں تو کسی پر دین عائد ہونا متصور ہی نہیں ہے، حادثات کی صورت میں ایک امکان پایا جاتا ہے، مگر اس صورت میں بھی ابھی مدیون کا نہ وجود ہے نہ وجود کے بعد وہ معلوم ہی ہوتا ہے، اور فتح القدیر میں مصرح ہے کہ: جهالة المكفول عنه تمنع صحة الكفالة اور مضمون نگار نے بیمہ دار کو جو اصیل قرار دیا ہے، وہ ان کی بھول ہے۔ ان کو بغور باب الکفالۃ کا مطالعہ کرنا چاہئے؛ بیمہ دار کی حیثیت مطالب کی اور اصیل مطالب ہوتا ہے، تو مطالِب مطالَب کیسے ہوسکتا ہے۔ اسی طرح ما أصابک في هذه الشجة کو بھی مستقبل کا خطرہ سمجھنا صحیح نہیں ہے، ہاں ضمان درک میں بظاہر مستقبل کے خطرہ کا ضمان ہے، مگر درحقیقت مستقبل کی ذمہ داری نہیں ہوتی، بلکہ ماضی کی ہوتی ہے، جس کا ظہور مستقبل میں ہوتا ہے، اور مکفول عنہ اس میں بھی معلوم و متعین ہوتا ہے۔ لہذا اس پر اس

صورت کو قیاس کرنا جس میں یا تو کسی پر دین عائد ہی نہیں ہوتا، یا ہوتا ہے مگر معلوم نہیں کہ کس پر عائد ہوتا ہے، قیاس مع الفارق ہے۔

۱۸- **من ضمن عن آخرِ خراجه** کا ترجمہ صحیح نہیں ہے، لہذا جو نتیجہ اس سے اخذ کیا گیا ہے وہ بھی صحیح نہیں ہے، اس کا صحیح ترجمہ یہ ہے کہ جو خراج کسی پر واجب ہے یا جو نوائب ''وقتی ٹیکس'' اسپر عائد ہوتے ہیں، یا جو قیمت اس کے ذمہ ہو، اس کی ضمانت کوئی لے لے تو جائز ہے۔ اس عبارت کی شرح اور نوائب وغیرہ کی تحقیق کے لیے ہدایہ (۱۰۹/۳) کی طرف رجوع کیجئے۔

۱۹- **ضمان خطر الطریق** کی بحث میں التزام مالا یلزم سے متعلق شامی کے جواب کو صرف غیر تسلی بخش کہہ دینا کافی نہیں ہے، جب تک کہ غیر تسلی بخش ہونے کی کوئی وجہ نہ بتائی جائے۔ میرے نزدیک شامی کی وہ بحث نہایت قوی اور دقتِ نظر پر مبنی ہے، خیر اس کو ابھی یونہی رہنے دیجئے، اس سے پہلے یہ سنئے کہ آپ نے جس طرح **ضمان خطر الطریق** والا جزئیہ شامی سے نقل کیا تھا، اسی طرح شامی ہی سے اس کی تعلیل بھی نقل فرما دیتے تو بغیر کسی کاوش کے ظاہر ہو جاتا کہ یہ جزئیہ کسی درجہ میں آپ کے مفیدِ مطلب نہیں ہے، ہر چند کہ آپ کو معلوم ہے مگر آسانی کے لیے درمختار کی عبارت کا جو ٹکڑا آپ نے نظر انداز کر دیا ہے اس کو میں نقل کیے دیتا ہوں، درمختار میں آپ کے منقولہ الفاظ کے بعد یوں ہے: **هذا وارد علی ما قدمه بقوله و لا تصح بجهالة المكفول عنه كما في الشرنبلالية، و الأصل أن المغرور إنما يرجع على الغارّ إذا حصل الغرور في ضمن المعارضة أو ضمن الغارّ صفة السلام للمغرور نصاً.** میرا مقصد اس عبارت سے نقل کرنے سے یہ ہے کہ اس متروکہ عبارت سے یہ ثابت ہوتا ہے کہ آپ کے مسئلہ میں ضامن قرار پانے کی وجہ غرور ہے، یعنی اگر زید نے عمرو سے یہ کہا کہ یہ راستہ مامون ہے تم اس کو اختیار

کرو، اگر وہ خطرناک ہوا اور تمھارا مال ہلاک ہوا، تو میں ذمہ دار ہوں، زید کے کہنے سے عمرو نے ایسا ہی کیا، نتیجہ یہ نکلا کہ راستہ پُر خطر تھا اس کا مال چھین لیا گیا، تو اس صورت میں زید پر تاوان عائد ہوگا، اس لیے کہ عمرو نے اس کے ہی کہنے سے دھوکہ کھایا۔ حاصل یہ ہے کہ جزئیہ مذکورہ میں زید پر تاوان ہونے کی بنیاد غرور ہے، اب اگر بیمہ میں بھی یہ بنیاد موجود ہو تو اس کو اس پر قیاس کیجئے ورنہ زبردستی نہ فرمائیے، چونکہ جس بیمہ کو حادثاتی بیمہ کہا جاتا ہے، اسی سے اس جزئیہ کی بظاہر مشابہت معلوم ہوتی ہے، اس لیے اسی کو لے کر بات کرتا ہوں کہ اس میں غرور کا تحقق قطعاً نہیں ہے، اس لیے کہ اس کے تحقق کے لیے ضروری ہے کہ غارّ کو سبب حادثہ کے متحقق ہونے کا پہلے ہی سے علم ہو، اور یہ بھی ضروری ہے کہ مغرور اس سے غافل ہو؛ اگر ان دونوں باتوں میں سے ایک بھی نہ پائی جائے گی تو غرور متحقق نہ ہوگا۔ اور بدیہی ہے کہ کوئی حادثاتی بیمہ جس وقت ہوتا ہے کمپنی یا اس کے ایجنٹ کو مثلاً اس کا علم نہیں ہوتا کہ بیمہ دار کی دوکان میں چار سال کے بعد آگ لگ جائے گی جس کے لیے فلاں فلاں دلائل ہیں، اگر کمپنی کو یہ علم ہوتا اور وہ بیمہ دار کو اطمینان دلاتی کہ آگ لگنے کے امکانات نہیں ہیں، تو یہ غرور ہوتا و إذ ليس فليس؛ نیز بیمہ کی شکل میں غرور کا وجود اس لیے بھی نہیں ہے کہ کمپنی بجائے یہ کہنے کے کہ آگ لگنے کا اندیشہ نہیں ہے، یہ کہتی ہے کہ آگ لگنے کا امکان ہر وقت ہے، بیمہ کرالو تو کمپنی نقصان کی ذمہ دار ہو جائے گی۔

اس کے علاوہ یہ جزئیہ بیمہ پر اس لیے بھی منطبق نہیں ہے کہ اس میں زید بلا کسی ذاتی مفاد کے اپنے ذمہ ایک تاوان لے لیتا ہے، اس میں زید یہ نہیں کہتا کہ مجھ کو دو سو روپے تجارت کے لیے قسط وار دیتے رہو، میں تم کو اس کا سود (یا منافع) بھی دیتا رہوں گا، اور اگر سال کے اندر تم نے فلاں راستے سے سفر کیا تو میں اطمینان دلاتا ہوں کہ وہ مامون ہے، لیکن اگر پُر خطر ہوا اور تمھارا مال لُٹ گیا، تو اس کا بھی ذمہ دار ہوں، زید اگر یہ کہتا تو بے شک اس کی شکل بیمہ کی ہی ہوتی، اور شامی وغیرہ نے اسی صورت

مسئلہ کو جائز کہا ہوتا تو بے شک اس سے بیمہ کے جواز پر بھی روشنی پڑتی، لیکن جب ایسا نہیں ہے، تو بیمہ جیسے معاملہ کو جو بہت سے اجزاء سے مرکب ہے اس طرح جائز بنانے کی کوشش کرنا کہ اس کے کسی ایک جز کو لے لیا جائے اور باقی تمام اجزاء سے آنکھ بند کر لی جائے، پھر کتبِ فقہ سے کوئی جزئیہ ڈھونڈھ کر کہہ دیا جائے کہ بیمہ کا فلاں جز چونکہ اس جزئیہ کے مطابق ہے، اس لیے بیمہ اپنے تمام اجزاء اور پورے مالہ و ما علیہ کے ساتھ جائز ہے، تو یہ کوشش میرے نزدیک فقہ اسلامی کے ساتھ مذاق ہے۔

اس کے بعد میں مناسب سمجھتا ہوں کہ فقہ حنفی کے چند جزئیات نقل کر کے گذارش کروں کہ مسئلہ پر غور کرنے کے وقت ان کو بھی نظر میں رکھا جائے:

(۱) درمختار میں ہے کہ اگر کوئی کہے کہ إن أكلك سبع فعليَّ الدية تو کہنے والا ضامن قرار نہ دیا جائے گا، اور شامی میں اس کی تعلیل یوں مذکور ہے: لأن فعله غير مضمون لحديث جرح العجماء جبار (۲۷۷/۴)

(۲) درمختار میں ہے: ما غصبك أهل هذه الدار فأنا ضامنه فإنه باطل حتى يسمى انساناً بعينه (۲۷۷/۴)

(۳) شامی میں ہے: فلا يجوز كما إذا قال لرجل بايع في السوق فما خسرت فعليَّ، اور درمختار میں ایک مسئلہ کے ضمن میں ہے: لأنه إما ضمان الخسران أو توكيل بمجهول و ذلك باطل (۲۹۱/۴)

(۴) شامی میں ہے: كل من المودع و الاجير المشترك لا يضمن ما لا يمكن الاحتراز عنه كالموت و الغرق و نحو ذلك (۲۵۷/۳)

(۵) شرط غیر ملائم کی وجہ سے کفالت باطل ہو جاتی ہے (شامی ۲۷۸/۴)

(۶) بزازیہ میں ہے: بايع فلانا على أن ما أصابك من خسران فعليَّ أو قال إن هلك عينك هذا فأنا ضامن لم يصح (شامی ۲۹۶/۴)

(۷) بزازیہ میں ہے: لو جعل للکفیل أجراً لم یصح (اشباہ/۱۰۹)

ان جزئیات کو سامنے رکھنے سے منقح ہوگا کہ کن چیزوں کا ضمان صحیح ہے، اور کن کا نہیں، اور کون سی کفالت صحیح ہے اور کون سی غیر صحیح۔

۲۰- "مال امانت میں مالک کی اجازت سے تصرف کیا جا سکتا ہے"۔ یہ عبارت بہت موہم ہے، صحیح و صاف یہ ہے کہ مالک کی اجازت سے امین اپنے مال میں مال امانت کو ملا سکتا ہے، مگر پھر ودیعت باقی نہ رہے گی شرکت املاک ہو جائے گی۔ جس کا نتیجہ یہ ہوگا کہ إن هلك هلك من مالهما جميعاً و يقسم الباقي بينهما على قدر ما كان لكل واحد منهما كالمال المشترك (شامی ۴/۴۱۹)

اور اگر تصرف سے تجارت وغیرہ کی اجازت مراد ہے، تو اس صورت میں منافع تجارت وغیرہ میں بقدر مال کے حصہ دار ہونا چاہئے جو بیمہ میں مفقود ہے۔

علاوہ بریں ضمان کے وجوب یا عدمِ وجوب کا مسئلہ عقدۂ لا ینحل نہیں ہے، بیمہ دار جو رقم دیتا ہے وہ تو کسی نہ کسی طرح وصول ہی ہوتی ہے؛ عقدۂ لا ینحل یہ ہے کہ بیمہ دار نے ایک دو قسط دے کر بند کر دیا، تو اگر یہ امانت ہے تو ادا شدہ قسطیں سوخت کیوں ہوتی ہیں؟ اور عقدۂ لا ینحل یہ ہے کہ اگر یہ امانت ہے تو بیمہ دار نفس امانت یا صرف اس کے تاوان کا حق دار ہے۔ اس پر منافع اور مرنے یا حادثہ کی صورت میں اپنی رقم سے زائد کا حق دار کس فقہی جزئیہ سے ایک مودع کو قرار دیا جا سکتا ہے۔ یا معاملہ میں ان تصریحات کے ہوتے ہوئے اس کو "ایداع" کا جائز و صحیح معاملہ کیونکر قرار دیا جا سکتا ہے۔

۲۱- بیمہ کا شرعی حکم معلوم کرنے کے لیے اس کی ہیئت مجموعی کو نظر میں رکھنا چاہئے، مثلاً بیمہ کو ودیعت قرار دیجئے تو یوں غور فرمائیے کہ یہ ایک ودیعت کا معاملہ ہے، جس میں مالِ ودیعت سے مودَع کاروبار کرتا ہے، اور آپ کے ارشاد کے مطابق

رقم پر سود نہیں بلکہ کاروبار کے منافع کا ایک حصہ (جو معاملہ کے وقت مجہول ہوتا ہے) مودِع کو دینا طے ہوتا ہے، اور اس کا بھی معاہدہ ہوتا ہے کہ مودِع ایک خاص مدت تک مالِ ودیعت کو واپس نہیں لے سکتا، اور سب سے اہم معاہدہ یہ ہوتا ہے کہ اگر مدتِ مقررہ کے اندر مودِع مر گیا، یا اس کی دوکان کو آگ لگ گئی تو جتنا زرِ ودیعت اب تک مودَع کے پاس جمع ہے، اس سے ہزار پانچ سو زائد مودِع کو ملے گا، اور یہ محض تبرع نہیں ہوتا، بلکہ قانوناً لازم ہوتا ہے وغیرہ وغیرہ۔

شرعی حکم معلوم کرنے کا یہ طریقہ صحیح نہیں ہے کہ بیمہ کے معاملہ کے ہر ہر جز کو الگ الگ فرض کر کے اس جز کا حکم دوسرے اجزاء اور ان کے باہم ارتباط سے قطعِ نظر کر کے بتایا جائے۔

اسی طرح بیمہ کا حکم بتانے کے وقت اس کی اصلی و واقعی حالت کو چھپانے اور مسخ کرنے کی کوشش نہ کی جائے، مثلاً آپ خود ہی فرماتے ہیں کہ بیمۂ زندگی میں پہلے ڈاکٹری معاینہ کے ذریعہ بیمہ کرانے والے کی صحت و تندرستی اور عمر طبعی وغیرہ کا اندازہ لگایا جاتا ہے، اس معاینہ کے بعد کمپنی سے مقررہ رقم پر متعینہ مدت کے لیے ایک معاہدہ ہوتا ہے (ص۴) اس عبارت میں صرف معاملہ کی نوعیت کے اخفاء کے لیے آپ صاف صاف یہ نہیں کہتے کہ کمپنی ڈاکٹری معاینہ کے بعد پیشین گوئی کرتی ہے یا ذمہ لیتی ہے کہ بیمہ دار دس سال تک نہیں مرے گا، اور اگر مر گیا تو کمپنی پوری طے شدہ رقم اس کے وارثوں کو ادا کرے گی، چاہے اس رقم کا ایک تہائی یا چوتھائی ادا ہوا ہو، اور اگر نہیں مرا تو مدت معینہ کے بعد بیمہ دار اپنی رقم مع منافع (تاکہ آپ خفا نہ ہوں) وصول کرے گا۔ کیا یہ قمار نہیں ہے؟ اگر نہیں ہے تو اس کو بوضاحت لکھئے، صرف یہ کہنا کہ یہ باتیں عدمِ واقفیت کی بنا پر کہی جاتی ہیں، کافی نہیں ہے۔ مہربانی کر کے آپ اپنی واقفیت کا ثبوت دیجئے، پھر ناواقفیت کی تہمت دوسروں پر رکھئے۔

والسلام

اسلام میں بیمہ کا حکم

تالیف
عبداللہ ناصح علوان

ترجمہ
مسعود احمد الاعظمی

بسم اللہ الرحمن الرحیم

الحمد لله رب العالمين، و أفضل الصلاة و أتم التسليم على سيدنا محمد و على آله و أصحابه الغر الميامين، و على دعاة الحق، وقادة الخير بإحسان الى يوم الدين، و بعد!

انشورنس کی بحث عصر حاضر کے نت نئے اہم مسائل میں سے ہے، اور بہت سے مسلمان اس اہم، روز افزوں اور نئے مسئلے میں اسلام کا حکم جاننے کی خواہش رکھتے ہیں۔

قارئین اس رسالہ میں انشورنس کے سلسلے میں شریعت کے حکم کو دلیل و برہان سے مرصع اور آراستہ، اور تشریع و معقولیت کی حکمت سے پیراستہ پائیں گے۔

واقعہ یہ ہے کہ میں نے اس کی تحقیق میں اپنی پوری قوت فکر اور حق تک رسائی کی بھرپور کوشش صرف کی ہے، اگر میں اپنی اس تحقیق میں حق بجانب ہوں، تو یہ محض خدا کا فضل و احسان ہے، اور اگر مجھ سے غلطی سرزد ہوئی ہو، تو میں اس کے لیے معذرت خواہ ہوں کہ میں نے حق کا قصد کیا ہے، اور اسی کے واسطے کد و کاوش کی ہے۔ خدائے پاک ہی نیت و ارادہ کا جاننے والا ہے، اور وہی سچے اور مخلص لوگوں کو ان کا بدلہ دیتا ہے۔

مؤلف

عبداللہ ناصح علوان

بیمہ کا مقصد اور اس سلسلے میں علماء کا موقف

وہ جدید اور نت نئے مسائل و مشکلات جن میں وسیع تر فقہی مطالعہ کی ضرورت ہے، اور جو شریعت کے مخلص اہل علم کو فکر ونظر اور حق کی طرف رہنمائی کی دعوت دیتے ہیں، ان میں ایک مسئلہ بیمہ (انشورنس) کا ہے اور یہ کہ اس کے بارے میں اسلام کا موقف کیا ہے۔

بیمہ سے مراد جیسا کہ معلوم و معروف ہے، کبھی زندگی کا بیمہ ہوتا ہے، اور کبھی حوادث و خطرات اور کبھی مال کا بیمہ ہوتا ہے۔ اس کے ذریعہ اس خوف کا مقابلہ کرنا مقصود ہوتا ہے، جس کو سرمایہ دار راستوں، آتش زدگی اور چوری و ڈکیتی کے خطروں سے محسوس کرتا ہے، جس کا اس کو اپنے اور اپنی موت کے بعد اپنے اہل وعیال کی نسبت اس کو اندیشہ ہوتا ہے۔

اس کی شکل یہ ہے کہ ایک شخص یہ خیال کرتا ہے کہ اس کی جان یا مال کو خطرہ درپیش ہے، وہ اس خطرہ کے اثرات و نتائج کو دور کرنے یا کم کرنے کے لیے ایسے لوگوں کے ساتھ معاہدہ کرتا ہے، جو حادثہ پیش آنے کے بعد اس کی تلافی اور تدارک کی ذمہ داری لیتے ہیں، اور اس کے لیے وہ ان کو یکمشت یا قسطوں میں معاوضہ ادا کرتا ہے، اس آدمی کو مؤمَّن لہ یا مُستامِن (INSURED- بیمہ دار) کہا جاتا ہے، یعنی جس کا بیمہ کرایا گیا ہے، وہ اس معاملہ کا ایک فریق ہوتا ہے، فریق ثانی بیمہ کمپنی ہوتی ہے، اس کو مؤمِّن (INSURER) کہا جاتا ہے۔

بیمہ کرانے والے شخص کے حادثہ کا شکار ہونے کی صورت میں بیمہ کمپنی اس کو

ایک بڑی رقم دیتی ہے، اور یہ رقم کبھی کبھی اس رقم سے بہت زیادہ ہوتی ہے، جو شخص مذکور نے بیمہ کمپنی کو قسط وار ادا کی ہوتی ہے، یہی وہ چیز ہے جس کو اس کے مفہوم و معنی کے اعتبار سے بیمہ (INSURANCE) کہا جاتا ہے۔

بیمہ یا انشورنس کا آغاز قرون وسطی میں (تقریباً ۱۴۹۸ء) میں لویڈز نامی لندن کے ایک مشہور قہوہ خانے میں ہوا، اور وہیں ایک کمپنی قائم ہوئی، جو اس وقت دولت کے بازاروں میں کافی شہرت رکھتی ہے۔

بیمہ کا آغاز پہلے پہل کشتی، ساز و سامان اور قرض کے انشورنس سے ہوا، پھر اس نے زندگی اور عدم خیانت کے بیمہ تک ترقی کی، پھر اور ترقی کر کے استعداد و صلاحیت اور حسن و جمال کے انشورنس تک پہنچا، چنانچہ مغنی (گلوکار) اپنی مترنم آواز کا بیمہ کراتا ہے، رقاصہ (DANCER) اپنی پنڈلیوں کی چمک دمک کا بیمہ کراتی ہے، اور سیاستداں اپنی پارٹی پوزیشن اور رائے دہندگان کے نزدیک اپنی حیثیت کا بیمہ کراتا ہے، اس کے علاوہ اور بھی بہت سے سوقیانہ اور مبتذل قسم کے بیمے ہوتے ہیں، جن کا محرک وہ سرکش مادی موجیں ہیں جو اخلاقی بگاڑ اور اباحیت و شہوت رانی کے جذبات سے لبریز ہوتی ہیں۔

اس لیے جائز نہیں کہ علماء دین اس نئی صورتحال کے سامنے تماشہ بین کی حیثیت سے کھڑے رہیں، جبکہ یہ چیز روئے زمین کے اکثر حصوں اور بہت سے مسلم ممالک میں بری طرح پھیل چکی ہے، اور لوگوں کی پرائیوٹ اور پبلک لائف کا حصہ بن چکی ہے۔

لہذا حضرات علماء کے لیے ضروری ہے کہ پوری کوشش صرف کر کے عام مسلمانوں کے سامنے اس مسئلہ کے بارے میں شریعت کے حکم کو واضح فرمائیں۔

اگر یہ شریعت کے اصول و نظریات سے ہم آہنگ ہے تو اس کا برملا اعلان

فرمائیں، تاکہ لوگ تذبذب وتردد اور گناہ میں نہ مبتلا ہوں، اور اگر یہ قرآن وحدیث کے معارض اور شرعی اصول وقواعد کے خلاف ہے، تو پھر ان کا فرض ہے کہ عوام کو اس سے باخبر کریں اور ان کو اس سے باز رکھیں، تاکہ وہ حرام کام کے مرتکب نہ ہوں، اور ناحق مال کھانے سے محفوظ رہ سکیں۔

آئندہ صفحات میں میں بیمہ یا انشورنس کو جائز قرار دینے والوں اور ناجائز قرار دینے والوں کے دلائل پیش کروں گا، پھر ان دلائل کے درمیان موازنہ کروں گا، تاکہ اس ترجیح تک پہنچ سکوں جس سے حق واشگاف ہو جائے۔ اور اگر وہ حرام ہوگا، تو میں اس کے متبادل (ALTRNATE) کا بھی ذکر کروں گا۔ اور خدا ہی صحیح راستہ دکھا سکتا ہے، اور دستگیری فرما سکتا ہے، اور صحیح توفیق عطا فرما سکتا ہے۔

بیمہ کو کن لوگوں نے جائز کہا ہے
اور ان کی دلیل کیا ہے؟

بیمہ کو مع اس کی تمام اقسام کے جائز قرار دینے والے مشہور علماء میں استاذ مصطفیٰ زرقاء، استاذ عبدالرحمٰن عیسیٰ، استاذ محمد یوسف موسیٰ اور استاذ علی خفیف ہیں، اور وہ دلائل جن کا ان حضرات نے ذکر کیا ہے، یکساں اور ایک دوسرے سے ہم آہنگ ہیں، مگر میں استاذ مصطفیٰ زرقاء کے بیان کردہ دلائل پر اکتفا کروں گا، کیونکہ وہ زیادہ ہمہ جہت اور ان کے ہم خیال حضرات کی دلیلوں کے مقابلہ میں زیادہ قوی اور باوزن ہیں۔

ان حضرات کے دلائل اختصار کے ساتھ قارئین کی خدمت میں پیش کیے جاتے ہیں، جن کو ہم نے ان کی کتاب "عقد التامین" صفحہ ۵۵ سے نقل کیا ہے:

شیخ موصوف طویل سلسلۂ کلام کے بعد فرماتے ہیں: علاوہ بریں ہم کو احکام شریعت، اصول فقہ اور عباراتِ فقہا میں ایسی دلیلیں ملتی ہیں، جو بیمہ کے جواز کے لیے واضح اور قیاسی سند بن سکتی ہیں، ان میں سے خاص خاص حسبِ ذیل ہیں:

۱۔عقد موالاۃ اس عقد کا خلاصہ یہ ہے کہ ایک مجہول النسب شخص ایک عربی سے کہتا ہے کہ "تو میرا ولی ہوگا؛ اگر میں قتل کا ارتکاب کر بیٹھوں گا تو تم میری دیت (۱) ادا

(۱) دیت (خون بہا) قتل خطا کے جرم میں مالی معاوضہ دینے کا نام ہے۔ عقد موالاۃ کے قائل بڑے بڑے فقہاء صحابہؓ رہے ہیں، جیسے حضرت عمرؓ، حضرت ابن مسعودؓ، حضرت ابن عباسؓ، حضرت ابن عمرؓ، اور اسی کو حضرت امام ابوحنیفہ اور ان کے اصحاب نے اختیار کیا ہے۔

کروگے، اور اگر میں مرجاؤں تو تم میرے وارث ہوگے"۔ یہ عقد موالاۃ، معاہدۂ بیمہ کی شکلوں میں ایک زندہ شکل ہے؛ اس طرح کہ عربی، مجہول النسب کی ذات سے پیش آنے والے نقصان کی ذمہ داری اپنے سر لیتا ہے۔ تو عقد موالاۃ اور عقد تامین (معاہدۂ بیمہ) کے مابین مشابہت کی وجہ یہی ذمہ داری کا تحمل ہے۔

۲- حنفیہ کے نزدیک راستہ کے خطرہ کی ضمانت اس کا خلاصہ یہ ہے کہ ایک شخص دوسرے سے یہ کہے کہ "اس راستہ سے جاؤ یہ محفوظ اور بے خطر ہے، اور اگر تم کو کوئی مصیبت پہنچے گی تو میں تمھارا ضامن ہوں گا"۔ اس کے بعد اگر وہ شخص اس راستہ کو اختیار کر کے اس پر چلتا ہے اور اس کو کوئی نقصان لاحق ہوتا ہے، تو دوسرا شخص چونکہ اس کا ضامن ہے، اس لیے وہ اس کے نقصان کا تاوان ادا کرے گا۔

مجھے اس مسئلہ میں ایسی فقہی باریکی نظر آتی ہے، جو اس بات کی صلاحیت رکھتی ہے کہ خطرات کی وجہ سے مال کے بیمہ کے جواز کی زوردار استثنائی نص قرار پائے۔

۳- مالکیہ کے نزدیک التزامات اور وعدہ لازم کرنے والا قاعدہ اس کا حاصل یہ ہے کہ اگر کوئی شخص کسی دوسرے سے کسی قرض یا خسارہ کے تحمل، یا عاریت پر کچھ دینے، یا اس جیسی چیز کا وعدہ کرے، جو دراصل اس پر واجب نہیں ہے، تو کیا وہ شخص اس عہد کا پابند ہوگا، اور اگر وہ اس کا ایفا نہ کرے تو کیا اس پر اس موعود کی ادائیگی کا فیصلہ کیا جائے گا یا نہیں؟

فقہاء مالکیہ کی اس مسئلہ میں چار رائیں پائی جاتی ہیں:

منجملہ ان کے یہ ہے کہ اس کا علی الاطلاق اس پر فیصلہ کیا جائے گا، یعنی وہ اس پر لازم ہے"

ہم اگر اس مسئلہ کو اور زیادہ وسعت دے دیں، تو ہم کو التزامات کے اس

قاعدہ میں اس بنا پر بیمہ کے استنباط کی گنجائش نظر آتی ہے، کہ اس میں بیمہ کمپنی پر بیمہ کرانے والے کا حق لازم ہوتا ہے، اگرچہ وہ بلا عوض صرف اس وعدہ پر ہے کہ وہ اس کو درپیش خطرے کے نقصانات کا متحمل ہوگا، یعنی اس کے خساروں کا عوض ادا کرے گا۔

۴- اسلام کا نظام عاقلہ: اس کا خلاصہ یہ ہے کہ اگر کوئی شخص بلا قصد و ارادہ کسی کے قتل کا مرتکب ہو، جس کا اصلی حکم دیت (خون بہا) ہے نہ کہ قصاص، تو یہ دیت ان لوگوں پر تقسیم ہو جاتی ہے، جن کے درمیان اور اس قاتل کے درمیان عموماً باہمی تعاون ہوا کرتا ہے، اور وہ اس کے خاندان اور قبیلہ کے بالغ فراد، اور وہ لوگ ہیں جو اس کے معاون و مددگار ہوتے ہیں اور جن میں اس کا شمار ہوتا ہے۔

میں کہتا ہوں کہ یہ گفتگو اس بات پر صراحۃً دلالت کرتی ہے کہ اسلام کا نظامِ دیت درحقیقت امداد باہمی کا ایک اچھا طریقہ ہے، جو اسلام سے پہلے بھی قتل، آتشزدگی اور چوری جیسی مالی آفتوں کا غم بانٹنے کے لیے موجود تھا، تاکہ مصیبت زدہ شخص سے اس کے بوجھ کو کم کیا جا سکے، اس کا مقصد ایک طرح سے اس مصیبت زدہ کے نقصان کی تلافی ہے، اور یہ خیانت کی وجہ سے جس کا ضرر ہوا ہے، اس کے حقوق کو زندگی ملے، مفت میں اس کا حق برباد نہ ہو۔

لہذا اس بات میں کیا رکاوٹ ہے کہ مالی آفات سے نبرد آزما ہونے کے واسطے اس تعاون کو منظم بنانے کے لیے ایک ایسا دروازہ کھول دیا جائے، جو باہم معاہدہ اور آزاد ارادہ کے ذریعہ اس کو لازمی بنا دے، جیسا کہ شریعت نے دیت کے نظام میں بغیر کسی معاہدہ کے اس کو لازم کیا ہے؟

۵- حکومت کے لیے ریٹائرمنٹ اور پنشن کا نظام: اس کا حاصل یہ ہے کہ سرکاری ملازم کے مشاہرہ (ماہانہ تنخواہ) سے ایک معمولی اور مختصر رقم وضع کر لی جایا کرتی ہے، حتی کہ وہ جب قانونی بڑھاپے (ریٹائرمنٹ) کی عمر کو پہنچتا ہے اور ریٹائر ہو جاتا

ہے، تو - اب وہ ملازم نہ رہتے ہوئے بھی - ہر مہینے تنخواہ (پنشن) پاتا ہے، جو اس معمولی رقم سے کئی گنا زیادہ ہوتی ہے، جو ہر مہینے اس کی تنخواہ سے وضع کی جاتی تھی، اور یہ پنشن جب تک وہ بقید حیات رہتا ہے اس کو ملتی رہتی ہے۔

اس نظام اور لائف انشورنس (زندگی کا بیمہ) میں فرق کیا ہے؟

معلوم ہونا چاہئے کہ اس پنشن کو تمام علماء اسلام بلانکیر جائز ٹھہراتے ہیں، اور شرعی نقطۂ نظر سے اس میں کوئی کھٹک نہیں محسوس کرتے۔

پھر شیخ زرقاء کچھ بحث وتمحیص کے بعد فرماتے ہیں کہ: حاصل یہ ہے کہ بیمہ کے نظام کو اسلامی فقہ وشریعت کے تمام شرعی دلائل صراحۃً جائز قرار دیتے ہیں، اور اس کی تحریم پر کوئی شرعی دلیل نہیں قائم ہوتی، اور اس کے راستے سے وہ تمام شکوک و شبہات دور ہو جاتے ہیں، جو اس کو حرام کہنے والوں کے دل و دماغ میں سر ابھارتے ہیں۔

اس اہم، پُر خار اور متنازع فیہ موضوع میں یہ میرا نقطۂ نظر ہے، اگر یہ صحیح ہے تو خدائے پاک کی توفیق سے میں اسی کا امیدوار ہوں، اور اگر غلط ہے تو میں معذرت خواہ ہوں کہ وہ ضروری بحث وتحقیق اور دلائل کی رو سے شریعت مطہرہ کے حکم کی معرفت کے لیے کدو کاوش کا نتیجہ ہے، اور خدا ہی کے لیے اس کا قصد کیا گیا ہے، والسلام علیکم۔

یہ ان دلائل کا نچوڑ ہے جن کو استاذ جلیل شیخ مصطفیٰ زرقاء نے انشورنس کے جواز کے سلسلے میں ''ہفتۂ فقہ اسلامی'' کانفرنس منعقدہ ۱۹۶۱ء دمشق میں پیش کیا تھا۔

بیمہ کو حرام قرار دینے والے حضرات اور ان کے دلائل

عصر حاضر سے قبل کے فقہاء متاخرین میں فقہ حنفی کی مشہور کتاب حاشیہ ردالمحتار علی الدر المختار کے مصنف علامہ محمد ابن عابدین شامی ہیں۔

ردالمحتار (جلد۳ صفحہ ۲۴۹) کے باب المستامن کی فصل ثانی میں علامہ ابن عابدین نے اس سلسلہ میں جو کچھ فرمایا ہے، اس کا خلاصہ یہ ہے کہ دارالحرب کے مستامن کی مدد جب تک وہ دارالاسلام میں رہیں، امام (حاکم) پر واجب ہے، اور کسی مسلمان کے لیے دارالاسلام کے اندر اس مستامن کے ساتھ وہی عقود جائز ہوں گے، جو اس کے لیے مسلمانوں کے ساتھ جائز ہوں گے، اسی طرح یہ بھی جائز نہیں ہے کہ مستامن سے کوئی ایسی چیز لی جائے، جو از روئے شرع اس پر لازم نہیں ہوتی، خواہ وہ چیز رواج پذیر ہی کیوں نہ ہو، جس طرح بیت المقدس کے زائرین سے لی جاتی ہے۔

اس کے بعد فرماتے ہیں کہ:

جو ہم نے تحریر کیا ہے اسی سے اس سوال کا جواب بھی مل جاتا ہے، جس پر آج کل بکثرت عملدرآمد ہے، اور وہ یہ ہے کہ یہ رواج ہو چکا ہے کہ تجار نے کسی حربی سے ایک کشتی اجرت پر لی جس کی وہ اجرت ادا کرتے ہیں، اور اسی کے ساتھ وہ دارالحرب میں مقیم کسی حربی کو ایک مقرر رقم ادا کرتے ہیں، جس کو سوکرہ (۱) کہا جاتا ہے۔ اس کی شرط یہ ہوتی ہے کہ جب کبھی کشتی کا مال آتشزدگی، غرقابی، قزاقی یا کسی اور

---

(۱) سوکرہ فرانسیسی زبان کا لفظ ہے اور اس کا معنی امان اور اطمینان ہے، اب اس کا اطلاق معاہدہ بیمہ پر ہوتا ہے۔

وجہ سے ہلاک ہو جائے گا، تو اس آدمی نے جو رقم ان سے لی ہے وہ اس ہلاک شدہ مال کا ضامن ہوگا۔ اور اس حربی کا ایک وکیل ہوتا ہے، جو دارالاسلام میں حکومت کی اجازت سے اس کے ساحلی علاقوں میں مقیم ہوتا ہے، وہ وکیل تاجروں سے زرسوکرہ (بیمہ کی قسط) حاصل کرتا ہے، اور اگر ان کے مال کا کوئی حصہ سمندر میں ہلاک ہو جاتا ہے، تو وہ مستامن تاجروں کو اس کا پورا بدل دیتا ہے۔ اس مسئلہ میں جہاں تک میرا خیال ہے تاجر کے لیے ہلاک شدہ مال کا بدل لینا جائز نہیں ہے، اس لیے کہ یہ التزام ما لایلزم (اس چیز کا اپنے اوپر لازم کر لینا جو لازم نہیں ہوتی) ہے۔

التزام مالایلزم کی جو انھوں نے علت بیان کی ہے، اس کی مراد یہ ہے کہ بیمہ کرنے والے نے جس کو انھوں نے صاحبِ سوکرہ کا نام دیا ہے، عقد (بیمہ پالیسی) کے ذریعہ تاجر کو اس کے مال کی بربادی کے وقت اس کے جس معاوضہ کو اپنے اوپر لازم کر لیا ہے، اس کی ادائیگی کو شریعت لازم نہیں قرار دیتی، لہذا اس سے اس کو لینا بھی جائز نہ ہوگا، اس لیے وہ ودیعت رکھنے والے، یا عاریت یا اجرت پر کچھ لینے والے کی طرح ہوگا، جبکہ وہ ان کے اوپر عقد کے وقت ودیعت یا عاریت یا اجرت پر لی ہوئی چیز کی ضمانت کی شرط لگائے، اگر وہ قضا و قدر کی وجہ سے ان میں سے کسی کی زیادتی یا حفاظت میں کوتاہی کے بغیر ہلاک ہو جائیں، تو مذہب حنفی میں اس جیسی شرط سے ان پر کوئی چیز لازم نہیں ہوگی، اس لیے اس ضمان کا ان سے لینا بھی جائز نہ ہوگا۔

اس گفتگو کے بعد ہم اس نتیجہ تک پہنچتے ہیں کہ ابن عابدین نے جو فقہاء متاخرین میں سے ہیں، قواعدِ شریعت کے خلاف ہونے کی وجہ سے انشورنس کی تمام صورتوں کو ناجائز قرار دیا ہے۔

دورِ جدید کے فقہاء میں جن لوگوں نے بیمہ کو یکسر حرام قرار دیا ہے، یہ حضرات ہیں:

۱- علامہ شیخ محمد بخیت المطیعی الحنفی سابق مفتی مصر۔ علامہ ابن عابدین کے

بعد بیمہ کے موضوع پر بحث کرنے والے وہ سب سے پہلے عالم ہیں۔

عہد عثمانی میں اناطولیہ کے کسی عالم کی طرف سے ان کے پاس ایک استفتا آیا، انھوں نے اس کا جواب ایک رسالہ کی شکل میں دیا، جو مصر کے مطبعۃ النیل میں ۱۳۲۴ھ = ۱۹۰۶ء میں طبع ہوا۔

مرحوم کا جواب جو شیخ زرقاء کی کتاب عقد التامین کے صفحہ ۱۹ پر مذکور ہے اس کا ماحصل یہ ہے:

''از روئے شرع مال کی ضمانت دو طریقوں سے ہوتی ہے: یا تو کفالت کے طور پر یا تعدی اور اتلاف کے طور پر، اور بیمہ پالیسی پر کفالت کے شرائط کا انطباق نہیں ہوتا، کیونکہ بیمہ شدہ مال کی ہلاکت بیمہ کمپنی کی تعدی یا اتلاف سے نہیں ہوتی، اس لیے اگر بیمہ شدہ مال ہلاک ہو جائے، تو کمپنی پر تاوان عائد کرنے کی کوئی وجہ نہیں ہے، کیونکہ شرعی طور پر ضمانت کے اسباب موجود نہیں ہیں''۔ شیخ زرقاء کہتے ہیں کہ پھر شیخ بخیت رحمۃ اللہ علیہ نے اپنی بحث میں ابن عابدین ہی کا نہج اختیار کیا، لیکن اس موضوع پر ابن عابدین کی بحث کی طرف سرے سے کوئی اشارہ نہیں کیا ہے، پھر آخر میں یہ ثابت کرتے ہیں کہ بیمہ پالیسی ایک عقد فاسد ہے، جس میں بیمہ کمپنی یا نامعلوم بیمہ کرنے والے شخص کی طرف سے اس چیز کا التزام ہے جو از روئے شرع اس پر لازم نہیں ہوتی۔ پھر مرحوم اس نتیجہ تک پہنچتے ہیں کہ اگر بیمہ کرنے والا (حربی مستامن) ہلاک شدہ مال کا ضمان یا تاوان دارالحرب میں (دارالاسلام میں نہیں) ادا کرے، تو مسلمان کے لیے اس کو لینا جائز ہوگا، کیونکہ یہ صورت حربی کا مال اس کی رضامندی سے دارالحرب میں غدر و خیانت کے بغیر لینے کی ہے، اس کے سوا دوسری صورت میں لینا جائز نہیں۔

۲- شیخ کبیر علامہ محمد ابوزہرہ رحمۃ اللہ علیہ، قاہرہ یونیورسٹی کے شعبۂ قانون کے ڈین اور شعبۂ شریعت کے ہائر سٹڈیز کے صدر۔

موصوف بیمہ کو جائز قرار دینے والوں کے خلاف سرخیل اور پیش پیش ہیں، اور جو کوئی اس کے جواز کی دلیل پیش کرتا ہے، اس کا متانت وشائستگی اور مضبوط اور پُر زور دلائل کے ساتھ رد کرتے ہیں، انھوں نے ہی استاذ بزرگوار شیخ مصطفیٰ زرقاء کے یکم اپریل ۱۹۶۱ء کو دمشق میں منعقد ہفتۂ فقہ اسلامی کانفرنس میں بیمہ کے جواز کے سلسلے میں پیش کردہ دلائل کا جواب دیا تھا۔ مصطفیٰ زرقاء کی کتاب ''عقد التامین'' صفحہ ۷۷ سے یہ جواب قدرے اختصار اور تصرف کے ساتھ قارئین کے مطالعہ کے لیے پیش کیا جارہا ہے:

۱۔عقد موالاۃ سے استدلال کا جواب مرحوم فرماتے ہیں کہ سب سے پہلے عقد موالاۃ پر قیاس کے مسئلہ کو ہم لیتے ہیں۔ واقعہ یہ ہے کہ ایک استحصالی کمپنی کی جانب سے کیے گئے بیمہ اور عقد موالاۃ کے درمیان اس قیاس پر میں حیرت زدہ رہ گیا، اور اس حیرت کی وجہ یہ ہے کہ عقد موالاۃ کی صورت یہ ہے کہ اسلام قبول کرنے والا ایک غیر عربی شخص کسی عربی مسلمان کے ساتھ یہ معاہدہ کرتا ہے کہ اگر وہ (غیر عربی مسلمان) کسی قتل کا ارتکاب کرے، تو عربی اس کی دیت ادا کرے۔ اور وہ غیر عربی یہ عہد کرتا ہے کہ اگر اس کا کوئی وارث نہ ہو تو وہ عربی ہی اس کا وارث ہوگا۔ ان دونوں مسئلوں کے درمیان کسی مناسبت کا تصور بھی نہیں کیا جاسکتا، اور مجھے حیرت ہے کہ یہ استدلال شیخ زرقاء جیسے بڑے فقیہ نے کیا ہے۔ ہماری حیرت کے جواب میں انھوں نے یہ فرمایا ہے کہ تشبیہ کا مقصد بیمہ میں جرم کی ذمہ داری کی مناسبت ہے، اس لیے کہ عربی دیت کا متحمل ہوتا ہے، اور یہ تحمل جرم کی ذمہ داری ہے۔ اس وضاحت کے بعد ہماری حیرت کی کوئی انتہا نہیں رہ جاتی، اس لیے کہ عقد موالاۃ غیر عربی کو عربی کے خاندان میں شامل کر دیتا ہے، اس کی طرف اس کا انتساب ہوتا ہے، اور اس کا شمار اس کے ایک فرد اور فیملی ممبر کی طرح ہوتا ہے، اس کا خاندانی نام، اس کا لقب اور اس کا ٹائٹل اپنے اوپر چسپاں کرتا ہے، چنانچہ ابوحنیفہ فارسی کو ابوحنیفہ تیمی کہا جانے لگتا ہے۔

کیا کوئی شخص استحصالی کمپنی کے ساتھ ان میں سے کسی ایک بات کا بھی عہد کرتا ہے؟ کیا اس کی عمومی جمعیت کا رکن ہو جاتا ہے؟ اس کو اس کے بجٹ میں مداخلت کا حق حاصل ہو جاتا ہے؟ آمد وخرچ کے وسائل میں رائے زنی اور حساب فہمی کا موقع ملتا ہے؟ اور اگر ایسا نہیں ہے تو بیمہ عقد موالاۃ کی طرح کیونکر ہوسکتا ہے؟ یہ قیاس کھلا ہوا قیاس مع الفارق ہے، بلکہ اس مسئلہ میں مقیس اور مقیس علیہ میں سرے سے کوئی مناسبت ہی نہیں ہے۔

ب- نظام دیت سے استدلال کا جواب شیخ ابوزہرہ رحمۃ اللہ علیہ فرماتے ہیں کہ اس سے بھی زیادہ قیاسِ بعید انشورنس کو عاقلہ پر قیاس کرنا ہے، اس لیے کہ عاقلہ اس کے قرابت دار وعصبات ہوتے ہیں، تعاون علی البر والتقویٰ، امداد باہمی اور تعاون وتناصر ان کو باہم مربوط رکھتا ہے، کیا کسی بھی طریقے سے اس نظام کے مشابہ وہ مصنوعی عہد وپیمان ہوسکتا ہے، جو استحصال کرنے والی کمپنی اور اس فریق کے درمیان قول وقرار کا رہین منت ہوتا ہے جو ہر سال یا ہر مہینے ایک مخصوص رقم اس کمپنی کو ادا کرتا ہے، واقعہ یہ ہے کہ فاضل استاذ کے بیان کے بعد اس قیاس پر ہم انگشت بدنداں ہیں۔

ج- ریٹائرمنٹ اور پنشن کے نظام سے استدلال کا جواب مرحوم فرماتے ہیں کہ زرقاء صاحب کی کوشش یہ ہے کہ وہ تامین (انشورنس) کی تمام قسموں کو -خواہ وہ عملی تعاون کی شکل میں ہو، یا افراد اور بیمہ کمپنیوں کے درمیان معاہدہ کی صورت میں- اس باہمی تعاون میں داخل کرنا چاہتے ہیں، جس کی اسلام اور حدیث نبوی میں ترغیب دی گئی ہے (اور اسی میں ریٹائرمنٹ اور پنشن کا نظام بھی ہے)۔ وہ اس اجتماعی خوشحالی کے قیام کو جس کو حکومت انجام دیتی ہے، خواہ وہ عمال کے درمیان ہو، یا ملازمین کے درمیان، اور خواہ وہ عام اور سب کو شامل ہو، یا بعض گروہوں کے درمیان خاص ہو، صحیح اور مباح وجائز ہے، اس پر ہم کو کوئی اعتراض نہیں ہے، یہ ایک

اجتماعی تعاون ہے، خواہ اتفاقی ہو یا حکومت کی طرف سے عائد کیا گیا ہو؛ یہ ایک قسم کی بھائی چارگی ہے، اور اس کا سبب چاہے جو بھی ہو، لازم کرنے سے ہوا ہو یا ضروری قرار دینے سے۔

لہذا ہمارا اختلاف ان پالیسیوں تک منحصر ہے جو ان کمپنیوں کے ساتھ عمل میں آتے ہیں اور جن کا کام ہی بیمہ کے راستے سے استحصال (EXPLOITATION) ہوتا ہے۔

یہ بات درست ہے کہ وہ بیمہ جو قرون وسطیٰ میں وینس (VENICE) کے تاجروں کے درمیان عالم وجود میں آیا تھا، وہ اصل میں باہمی تعاون کے طور پر تھا، لیکن وہ یہود جو وینس کے سوداگروں کے بعد اقتصادیات پر قابض ہو گئے، انھوں نے اس کو اس کے باہمی تعاون کے مفہوم سے نکال کر واضح استحصالی مفہوم میں داخل کر دیا۔ اب اگر کوئی شخص اس الٹ پھیر کے بعد بھی امداد باہم کے معنیٰ پر مصر رہتا ہے، تو اس کی مثال اس شخص جیسی ہے جو شراب کو اس وجہ سے حلال کہتا ہے کہ وہ حلال انگور سے بنی ہے، بلکہ میں تو کہتا ہوں کہ یہ بیمہ جس کو استحصالی کمپنیاں بروئے کار لاتی ہیں، وہ امداد باہمی کی تبدیل شدہ صورت نہیں ہے، بلکہ اس کا مفہوم ہی دوسرا ہے، اگرچہ پہلے کے نام کا حامل ہے۔ اگر کوئی شخص کسی سفید فام کو حبشی کے نام سے پکارے، تو اس سے وہ حبشی نہیں ہو جائے گا، اور اگر کوئی سیاہ کو سفید کے نام سے یاد کرے تو اس سے وہ سفید نہیں ہو جائے گا۔

استحصال یا نفع اندوزی پر مبنی انشورنس کا دروازہ کھل جانے سے نہایت حیرت انگیز باتیں رونما ہو رہی ہیں، حتیٰ کہ اب تو یہ ہونے لگا ہے کہ عورتوں کے رنگ روپ اور ان کے ساق سیمیں کا بیمہ ہونے لگا ہے، اور اس طرح جب کہ اس کی حقیقت واصلیت صرف زر اندوزی تک رہ گئی ہے، تو کیا اس قسم کے انشورنس کو اس امداد باہمی کی توسیع کہا جا سکتا ہے، جو وینس والوں کے درمیان پائی جاتی تھی۔ بلکہ اس کے برعکس

پردہ وہ بدترین فتنہ پرور اور فساد انگیز یہودی ذہنیت کارفرما ہے، جو استحصال اور نفع اندوزی کے اسباب ایجاد کرتی ہے۔

قابل غور امر یہ ہے کہ شیخ ابوزہرہؒ نے مصطفیٰ زرقاء کی باتوں کا جواب دیتے وقت، حنفیہ کے نزدیک راستہ کے خطرہ کے ضمان کے پوائنٹ اور مالکیہ کے نزدیک لازم کرنے والے عہد اور التزامات کے قاعدہ سے تعرض نہیں کیا، حالانکہ یہ دونوں باتیں بھی ان قیاسی دلائل میں سے تھیں، جن سے شیخ زرقاء نے انشورنس کے جواز پر استدلال کیا تھا۔

ہم نہیں سمجھ سکتے کہ شیخ ابوزہرہؒ کے لیے ان دونوں نقطوں کا جواب نہ دینے کا محرک کیا تھا، غالباً ان کو اس پر اطمینان تھا کہ شیخ زرقاء کے پیش کردہ یہ تمام قیاسی دلائل انشورنس کے جواز کے لیے شرعی دلیل نہیں بن سکتے، اس لیے مثال کے طور پر چند باتوں کا جواب دیا، اور باقی سے چشم پوشی برت لی، واللہ اعلم۔

۳- انشورنس کو یک قلم حرام قرار دینے والے علماء میں "التامین الأصیل و البدیل" کے مصنف ڈاکٹر عیسیٰ عبدہ ہیں۔

یہاں میں ڈاکٹر عیسیٰ عبدہ کے قول کو معمولی تصرف کے ساتھ پیش کرتا ہوں وہ لکھتے ہیں کہ:

اب میں سوال کرنا چاہتا ہوں کہ:

کیا بیمہ کمپنیاں تجارتی ادارے ہیں؟

یا یہ امداد باہمی کے ادارے ہیں؟

یا یہ لوٹ کھسوٹ کا ایک طریقہ ہے جس کا مقصد حصولِ زر، جیبوں پر ہاتھ صاف کرنا اور دولت جمع کرنا ہے۔

اگر بیمہ کمپنیاں تجارتی ادارے ہوتے تو ضروری تھا کہ کمپنی کا ہر حصہ دار اسلامی تعلیمات کے مطابق نفع ونقصان کا متحمل اور ذمہ دار ہوتا۔

مثال کے طور پر حادثات کا جو بیمہ ہوتا ہے، اس میں بیمہ دار بیمہ کمپنی کو سال میں ایک مقرر رقم ادا کرتا ہے، اس کے بعد اگر وہ سامانِ تجارت، فیکٹری یا جہاز وغیرہ جس کا بیمہ کرایا ہے، صحیح سالم رہ جاتی ہے، تو کمپنی پوری رقم ہڑپ کر جاتی ہے، اور بیمہ دار اس رقم کا کوئی حصہ نہیں حاصل کر سکتا، اور اگر اس کے ساتھ کوئی حادثہ رونما ہو جائے، تو اس کے عوض میں صرف اتنی رقم ملتی ہے جس کا معاہدہ ہوا ہے، اور یہ چیز تجارت کی روح (SPIRIT) اس کے اصول اور حصہ دار کمپنیوں کے نظام سے ہم آہنگ نہیں ہے۔

اور زندگی کے بیمہ (LIFE INSURANCE) میں مثلاً کسی نے دس ہزار کا بیمہ کرایا، اور اس نے واجب الادا پہلی قسط ادا کی اس کے بعد اس کی موت واقع ہو گئی، تو وہ پورے دس ہزار کا مستحق ہوگا، اور اگر اس کو تجارت میں شریک مانا جائے تو جو قسط اس نے ادا کی ہے اور اس سے جو نفع حاصل ہوا ہے، اس سے زیادہ کا حقدار نہیں ہونا چاہئے، پھر اگر وہ بیمہ کمپنی کے ساتھ طے شدہ اپنے عہد میں کوتاہی کرتا ہے، اور (کچھ قسطیں ادا کرنے کے بعد) بقیہ قسطوں کی ادائیگی سے قاصر رہ جاتا ہے، تو اس نے جو ادا کیا ہے، وہ سب کا سب یا اس کا بڑا حصہ سوخت ہو جائے گا۔ اس کے بارے میں کم از کم یہ کہا جا سکتا ہے کہ یہ شرط فاسد ہے۔

اور یہ جو کہا جاتا ہے کہ بیمہ دار اور بیمہ کمپنی دونوں رضامند ہوتے ہیں، اور اپنی اپنی مصلحتوں سے وہ دونوں زیادہ واقف ہوتے ہیں، تو اس کا کوئی اعتبار اور اس دلیل میں کوئی وزن نہیں ہے، کیونکہ سود لینے والا اور دینے والا دونوں آمادہ ہوتے ہیں، جوا کھیلنے والے بھی دونوں رضامند ہوتے ہیں، لیکن ان کی رضامندی کا کوئی اعتبار نہیں ہوتا، جب تک ان دونوں کا معاملہ اس واضح انصاف کی بنیاد پر نہ قائم ہو جس میں دھوکہ اور ستم رانی کا کوئی شائبہ نہیں ہوتا، اور صرف ایک فریق کے فائدہ کی ضمانت نہ دی گئی ہو۔

آگے مزید فرماتے ہیں:

اگر بیمہ کمپنیاں کفالت اور امداد باہم کے ادارے ہوتے، تو ان پر تعاون و تکافل کے شرائط منطبق ہوتے۔

کیونکہ یہ بات معلوم ہے کہ جمع شدہ مال جو حصہ داروں کے درمیان تعاون و تکافل کے پہلو کو بروئے کار لاتا ہے، اس میں حسب ذیل شرائط کا پایا جانا ضروری ہے:

۱- یہ کہ حصہ دار فرد اپنے واجبی حصہ کو بطور تبرع (چندہ کے طور پر) محض قیام اخوت اور بھائی چارگی کے لیے ادا کرے۔

۲- جب اس ذخیرہ شدہ مال کے استعمال کا ارادہ کیا جائے تو صرف جائز طریقوں سے کیا جائے۔

۳- کسی فرد کے لیے یہ روا نہیں کہ تبرع اس بنیاد پر کرے کہ اگر وہ کسی حادثہ کا شکار ہوگا، تو اس تبرع کے عوض میں اس کو ایک مقرر رقم ادا کی جائے، البتہ اس کو ان تمام لوگوں کے مال سے ان کی حالت کے اعتبار سے اتنی رقم دے دی جائے، جو اس کے خسارہ یا خسارہ کے کچھ حصہ کا تدارک کر سکے۔

۴- تبرع ہبہ ہوتا ہے، اور ہبہ کو لوٹانا مکروہ اور بعض فقہا کے نزدیک حرام ہے؛ اس کی دلیل یہ حدیث ہے کہ ((الراجعُ في هِبَتِهِ كالرَّاجِعِ في قَيْئِه)) ہبہ کو واپس لینے والا قے کر کے چاٹنے والے کی طرح ہے۔

یہ شرطیں اس صورت پر منطبق ہو سکتی ہیں، جس کو ہمارے یہاں کے بعض ادارے اور انجمنیں انجام دیتی ہیں، کہ ایک شخص بطور تبرع ماہانہ حصہ ادا کرتا ہے، اس کو اسے لوٹانے یا واپس لینے کا حق نہیں ہوتا، اور نہ دیتے وقت کسی معین رقم کی شرط لگائی جاتی ہے، جو بوقت مصیبت اس کو ادا کی جائے۔

جہاں تک بیمہ کمپنیوں کا سوال ہے تو یہ شرائط ان پر کسی طرح بھی منطبق نہیں

ہوتے:

۱- بیمہ کرانے والے تبرع کی نیت سے نہیں رقم دیتے اور نہ ہی ان کے وہم و گمان میں یہ بات ہوتی ہے۔

۲- بیمہ کمپنیوں کا قیام و بقا مال کے حرام سودی طریقے سے استعمال پر ہوتا ہے۔

۳- بیمہ کرانے والا حادثہ رونما ہونے پر کمپنی سے ان تمام قسطوں کی مجموعی رقم جو اس نے دی ہے، بلکہ اس سے کہیں زیادہ حاصل کرتا ہے، اور یہ سود اور ناحق طریقے سے مال کھانا نہیں ہے تو اور کیا ہے؟

اسی طرح تامین (بیمہ) کے اندر تعاون کے مفہوم کے منافی جو چیز پائی جاتی ہے، وہ یہ ہے کہ ایک قدرت رکھنے والے سرمایہ دار کو ضرورت مند نادار سے زیادہ دیا جاتا ہے، وجہ یہ ہے کہ قدرت رکھنے والا بڑی رقم کا بیمہ کراتا ہے، تو وفات یا آفت کے وقت اس کو زیادہ حصہ دیا جاتا ہے، جبکہ امداد باہمی کے ادنیٰ اصولوں میں یہ ہے کہ محتاج یا مصیبت زدہ کو دوسرے سے زیادہ دیا جائے۔

۴- جو اپنے معاہدہ سے رجوع کرنا چاہے گا، تو جو رقم اس نے ادا کی ہے، اس سے بھی اس کو ہاتھ دھونا پڑے گا، یا کم از کم اس رقم کا بڑا حصہ کم کر لیا جائے گا۔ اور اس کی شریعت اسلام میں کوئی وجہ جواز نہیں ہے۔

مگر سوال یہ ہے کہ بیمہ کمپنیاں اگر اسلامی طرز کے تجارتی ادارے نہیں ہیں، اور نہ ہی وجدانی تعاون و تکافل کے طور پر امداد باہمی کے ادارے ہیں، تو پھر ہیں کیا؟

درحقیقت یہ ناحق حصول زر، بے سبب دولت لوٹنے اور چالبازی سے لوگوں کی جیبوں کو خالی کرانے کے وسائل ہیں، جس میں کبھی کبھی سادہ لوح اور کم اندیش لوگ پھنس جایا کرتے ہیں!!!

اور اس میں کوئی شک نہیں کہ یہ شریعت کے اصول سے متعارض اور اس کے

عام قواعد سے متصادم ہے، جیسا کہ تحریم کے دلائل کو پیش کرتے وقت آئے گا۔ ڈاکٹر عبدہ کی گفتگو ختم ہوئی۔

۴- بیمہ کو حرام قرار دینے والے علماء میں شیخ محمد علی بولاقی کویت کی موسوعۃ الفقہ الاسلامی کے اداری بورڈ کے ممبر اور معہد الدراسات العلیا مصر کے لیکچرر ہیں۔

وہ محمد رواس قلعہ جی کے نام اپنے مکتوب میں لکھتے ہیں:

زندگی کا بیمہ (LIFE INSURANCE) عقد فاسد ہے، کیونکہ وہ صحیح شرعی بنیادوں پر قائم نہیں ہے، اور عقد فاسد پر اقدام کارِ حرام ہے۔

اور عام حوادث یا کسی مخصوص قسم کے حادثہ کا بیمہ کرانا عقد معاوضہ ہے (عوض دینے کا پابند ہونا)، وہ جانبین سے دو متقابل چیزوں کے التزام پر مشتمل ہے۔

بیمہ کرانے والا ہر سال کمپنی کو ایک مقرر رقم ادا کرنے کا پابند ہوتا ہے، جس کو وہ کسی بھی حالت میں واپس نہیں لے سکتا، اور بیمہ کرانے والے کو جو اتفاقی نقصان پہنچتا ہے اس کا معاوضہ ادا کرنے کی کمپنی پابند ہوتی ہے، اس میں چند باتیں ہیں:

ایک یہ کہ کمپنی اس صورت میں اس تاوان کی پابند ہوتی ہے، جس کی وہ ضامن نہیں بنائی گئی ہے، اس لیے کہ حادثہ میں اس کا کوئی دخل نہیں ہے۔

دوسرے یہ کہ اس میں ضمان کا عوض لینا ہے، اور ضمان کو درست بھی تسلیم کرلیا جائے، تو اس کا عوض لینا جائز نہیں۔

تیسرے یہ کہ وہ معنیً قمار ہے، اس لیے کہ بیمہ کرانے والا اور بیمہ کمپنی نفع اور نقصان کے درمیان تردد میں ہوتے ہیں، اس لیے کہ بیمہ دار پر کبھی سالہا سال گزر جاتے ہیں، اس دوران وہ رقم ادا کرتا رہتا ہے، جو اگر کوئی حادثہ نہ رونما ہو تو اس کے لیے بے کار ہوتی ہے، اور کمپنی اس سے فائدہ اٹھاتی ہے، اور حادثہ پیش آنے کی صورت میں اس کا خسارہ کمپنی سہتی ہے اور بیمہ دار فائدہ اٹھاتا ہے۔

ان علتوں کی بنا پر بالآخر شیخ بولاقی عدم جواز کو اختیار کرتے ہیں۔

حرمتِ بیمہ کے دلائل

اولاً:-موجودہ بیمہ پالیسیاں ایک قسم کا میسر (جوا) ہیں، جس کو اللہ تعالی نے حرام فرمایا ہے، کیونکہ اس پر مَیسِر کی تعریف صادق آتی ہے۔اور میسر-جیسا کہ فقہا نے اس کی تعریف کی ہے- ہر وہ عقد ہے جس میں متعاقدین میں سے ایک بلا مقابل خسارہ کا شکار بنتا ہے، جو دوسرے فائدہ اٹھانے والے متعاقد کی طرف سے اس کو پہنچتا ہے۔

اگر ہم اس رقم پر غور کریں جو انسان بیمہ کمپنی کو اپنی زندگی یا تجارت کے لیے دیتا ہے، تو یہ بات سمجھ سکتے ہیں کہ اگر اس کی لائف اور بزنس یا کسی ایک کو کوئی حادثہ نہ پیش آئے تو اس کو کوئی فائدہ نہیں حاصل ہوتا، اور کبھی کبھی تو ایسا ہوتا ہے کہ پوری عمر کٹ جاتی ہے اور اس کو کوئی گزند نہیں پہنچتی اور نہ اس پر کوئی آفت نازل ہوتی ہے؛ لہذا کمپنی کو دی ہوئی یہ رقم اس کے مقابل کوئی مالی بدل نہ ہونے کی وجہ سے حلال نہیں ہے، اسی طرح بیمہ دار یا اس کے ورثہ اس کے نقصان کی صورت میں کمپنی سے جو رقم لیتے ہیں، اس کے جائز و حلال ہونے کی بھی کوئی صورت نہیں، اس لیے کہ اس کی اذیت رسانی میں کمپنی کا کوئی ہاتھ نہیں ہے، مزید برآں یہ کہ بعض ورثہ کی لالچ بیمہ کمپنی سے دولت کے حصول کے لیے کبھی اپنے مورث (وارث بنانے والے) کے قتل پر بر انگیختہ کرتی ہے، اور مقتول مورّث کے قتل کی سازش پوشیدہ رہ جاتی ہے، جس کا علم بجز خدا کے کسی اور کو نہیں ہوتا، لہذا یہ بیمہ پالیسیاں بدترین چیزیں ہیں جو اس قسم کے جرائم اور معاصی کے ارتکاب پر برانگیختہ کرتی ہیں۔

ثانیاً:- موجودہ بیمہ پالیسیاں اس بیع غَرَر کی ایک قسم ہے، جس کو شریعت اسلامیہ نے حرام قرار دیا ہے۔ اور غَرَر امکانی اشیاء کی اس بیع کا نام ہے جس کا انجام نامعلوم ہوتا ہے کہ آیا وہ شے حاصل ہوگی یا نہیں؟ جیسے شکار سے پہلے مچھلی کی بیع، اس لیے کہ بائع کے ہاتھ میں اس کا موجود ہونا محقق نہیں ہے، اور نہ اس کو اس کے حوالہ کرنے پر قدرت حاصل ہے، لہٰذا اس کا عقد بلا شبہہ باطل ہے، اور اس میں کوئی شک نہیں کہ انصاف پسند ناظرین بیمہ پالیسی کے بطلان کو شکار سے پہلے مچھلی کی بیع سے زیادہ سخت اور بڑھا ہوا سمجھتے ہوں گے، اس لیے کہ بیمہ کرانے والا اور بیمہ کمپنی دونوں ایسے امور کا عقد کرتے ہیں کہ بسا اوقات پوری عمر گزر جاتی ہے، اور وہ امر پیش ہی نہیں آتا، جس کا انھوں نے معاہدہ کیا ہے، یہ جانتے ہوئے کہ بیمہ دار بیمہ کمپنی کو قسط وار بڑی رقم ادا کرتا ہے، اور اس سے وہ کوئی نفع نہیں اٹھاتا، تو کیا اس دھوکے سے زیادہ بڑا کوئی دھوکہ ہوسکتا ہے کہ نہ جس کے انجام کی خبر نہ انتہا کا پتہ ہے؟

بیع غَرَر کی حرمت بہت سی احادیث میں آئی ہے، ان میں سے چند حدیثیں حسب ذیل ہیں:

امام مسلم، امام احمد اور اصحاب سنن نے حضرت ابو ہریرہ رضی اللہ عنہ سے روایت کیا ہے کہ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے بیع حصاۃ (۱) اور بیع غرر سے منع فرمایا ہے۔

امام احمد اور ابن ماجہ نے حضرت ابو سعید خدری رضی اللہ عنہ سے روایت کیا ہے کہ اللہ کے رسول صلی اللہ علیہ وسلم نے مفرور غلام کے خریدنے سے، اور ان جانوروں کے خریدنے سے منع فرمایا ہے جو ابھی پیٹ میں ہوں جب تک کہ وہ پیدا نہ ہوجائیں، اور

---

(۱) بیع حصاۃ اس بیع کا نام ہے، جس میں بائع اور مشتری ہر دو بہت سی چیزوں کے مجموعہ میں اس چیز پر اتفاق کر لیتے ہیں، جس پر کنکری جا گرتی ہے۔ اور بیع حصاۃ ہی کی طرح قسمت یا نشانہ بازی یا ہاتھوں سے چھو کر نمبروں کے موافق ہونے فیصلہ کرنا ہے

اس دودھ کے خریدنے سے منع فرمایا ہے جو ابھی تھنوں میں ہیں اور مال غنیمت کے خریدنے سے تا آنکہ وہ تقسیم ہو جائیں۔

امام احمد اور طبرانی نے روایت کیا ہے کہ رسول اللہ ﷺ نے فرمایا کہ مچھلیوں کو پانی میں نہ خریدو کیونکہ وہ دھوکہ ہیں۔

ان کے علاوہ اور بھی بہت سی حدیثیں ہیں، جن میں غرر کی ممانعت آئی ہے۔

ثالثاً:- بیمہ پالیسیاں درحقیقت رِہان (سٹہ) اور مجازفہ (اٹکل) پر قائم ہیں، اس لیے کہ کمپنی کا التزام ایک ایسے اندیشہ کے ساتھ معلق ہے جو واقع بھی ہو سکتا ہے اور نہیں بھی ہو سکتا، اگر خطرہ پیش آ جائے تو کمپنی انشورنس کی رقم یا اس کا معاوضہ ادا کرنے کی پابند ہوتی ہے، اور اگر نہ پیش آئے تو کمپنی پر کچھ بھی عائد نہیں ہوتا، اور اس کے پیچھے زراندوزی، حصول دولت اور بغیر کدوکاوش سرمایہ جمع کرنے کے علاوہ اور کوئی جذبہ کارفرما نہیں ہوتا۔

اب ذیل میں یورپین ماہرین اقتصادیات (ECONOMIST) کی کچھ ایسی شہادتیں پیش کی جا رہی ہیں، جو انھوں نے بیمہ پالیسی پر تنقید کرتے ہوئے اس کے مجازفہ، غیر قانونی رہان پر اور زراندوزی کا وسیلہ ہونے پر کی ہیں:

لارڈ مانسفیلہ کہتا ہے کہ بیمہ پالیسی کا مدار مجازفہ پر ہے، اسی وجہ سے بعض حالات میں اس کے درمیان اور نقدی رقوم پر مراہنہ (سٹے بازی) کے درمیان تفریق کرنا اصلاً دشوار ہو جاتا ہے۔

اور انگلستان کے تجارتی قانون کے بعض شارحین نے مانسفیلہ کے قول کو دلیل بنایا ہے، جیسا کہ ۱۹۲۰ء میں شائع شدہ اسٹیفنس کی کتاب میں مذکور ہے، یہ کتاب بٹر ورتھ اینڈ کمپنی لندن سے شائع ہوئی ہے۔

یہاں انگلینڈ کے تجارتی قانون کے شارح سلوٹر کا قول بھی نقل کر دینا مناسب ہوگا، وہ کہتا ہے کہ تامین (INSURANCE) کا مطلب امن خریدنا ہے. اور اس کی صورت یہ ہے کہ بیمہ دار کسی ناگہانی آفت سے پہنچنے والے ضرر کے اندیشہ سے پیش بندی کے طور پر کمپنی سے معاوضہ کا حق خریدتا ہے، اور اس کی قیمت کو اجرت یا قسط کہا جاتا ہے، اس کی ادائیگی اکثر سالانہ ہوتی ہے، اور جس چیز کا انشورنس کرایا گیا ہے، حادثہ کے پیش آنے کی صورت میں بیمہ کمپنی کے معاوضہ دینے کے عہد و پیان کو بیمہ پالیسی کہا جاتا ہے، اور یہ پالیسی محض مجازفہ (اٹکل) اور بے سبب دولت کمانے کا ذریعہ ہے اس کے علاوہ اور کچھ نہیں۔

انشورنس پر اس یورپین تنقید سے واضح ہو گیا کہ وہ مجازفہ اور رہان کی ایک صورت ہے، اور یہ کہ وہ نفع اندوزی اور سودے بازی ہے، جس کا مقصد لوگوں کی خدمت نہیں، بلکہ بعض ماہرین اقتصادیات کی تعبیر کے مطابق ان کی جیبوں کو تراشنا اور ان کو خالی کرانا ہے۔

اور اس بات کی دلیل کہ تامین (انشورنس) کا مقصد نفع اندوزی، حصول دولت وثروت اور لوگوں کی جیبوں پر ہاتھ صاف کرنا ہے، یہ ہے کہ ڈاکٹر عیسیٰ عبدہ اپنی کتاب التامين الاصيل و البديل میں صفحہ ۴۱ پر لکھتے ہیں:

ایک معمولی مگر سرگرم بیمہ کمپنی نے صرف ۱۹۶۸ء میں اپنی پونجی (CAPITAL) کا تقریباً چوتھائی خالص نفع کمایا، اور یہ خالص نفع قانونی اعتبار سے کمپنی کے شرکاء (PARTNERS) کو ملے گا، بیمہ پالیسی رکھنے والوں کا اس میں کوئی حق نہیں ہوگا۔

رابعاً:- بیمہ پالیسی اپنی حقیقت اور کیفیت کے لحاظ سے اس سودی لین دین پر قائم ہے، جس کو اللہ جل شانہ نے حرام فرمایا ہے، اس لیے اس میں کوئی شبہ نہیں کہ

اس کی حرمت سود کی حرمت کے برابر بلکہ اس سے بڑھ کر ہے، کیونکہ بیمہ پالیسیاں ایک طرف تو سود سے ہم آہنگ ہیں، اور دوسری طرف قمار (جوا) غَرَر اور مجازفہ و رہان پر مشتمل ہیں۔

خامساً:- عقد بیمہ (بیمہ پالیسی) اس رقم کے عوض میں جس کا معاہدہ ہوتا ہے (اس رقم کو قسط کہا جاتا ہے) امن کے فروخت پر قائم ہے، جیسے زندگی کا بیمہ، نقل وحمل کے وسائل کا بیمہ، مالِ تجارت اور عمارتوں کا بیمہ وغیرہ وغیرہ۔

لیکن یہ امن فروشی ایک ایسی معاشرتی اور سماجی خدمت (SOCIAL SERVICE) ہے، جس کو بروئے کار لانا حکومت کا فرض ہے، اگر حکومت اس میں کوتاہی سے کام لیتی ہے، تو وہی اس کی ذمہ دار اور جواب دہ ہے، اور اسی سے حضرت عمر بن الخطاب رضی اللہ عنہ کے اس قول کا مفہوم سمجھ میں آتا ہے، جو انھوں نے فرمایا ہے کہ خدا کی قسم اگر عراق کے دور افتادہ علاقے میں کوئی اونٹنی پھسل جائے، تو مجھے اندیشہ ہے کہ عمر سے اس کے بارے میں بازپُرس نہ کی جائے کہ تو نے اس کے لیے راستہ ہموار کیوں نہ کیا۔

جب باشندگانِ وطن کے لیے امن کی بحالی ایسی سماجی خدمت ہے، جس کی انجام دہی اور نگرانی حکومت کا فرض ہے، تو قانونی طور پر کسی فرد یا کمپنی کے لیے جائز نہیں ہے کہ نفع اندوزی اور حصول زر کے لیے اپنی اس کارگزاری سے فائدہ اٹھائے، کیونکہ یہ ڈیوٹی حکومت کے ان مخصوص فرائض میں شامل ہے جن کی ضمانت حکومت کے اوپر ہے، جیسے انصاف قائم کرنا، ظلم دور کرنا، امن بحال کرنا اور تمام شہریوں کے حقوق کی حفاظت کرنا۔

مثلاً کون یہ کہہ سکتا ہے کہ عوام کے درمیان عدل و انصاف کے قیام کے لیے ضروری ہے کہ انصاف پروری کے عمل کی دیکھ ریکھ کوئی کمپنی کرے، پھر اس کے پس

پردہ مادی منافع اور ذاتی فائدے حاصل کرے؟

اور کون کہہ سکتا ہے کہ غذائی اشیاء جیسے شکر، چاول، روٹی، تیل وغیرہ کی فراہمی کے عمل کی سرپرستی اور تمام افراد کے لیے اس کی فراہمی کو یقینی بنانا کسی کمپنی کا فرض ہے، تاکہ کمپنی اس کی آڑ میں خوب دولت کمائے؟

یہ اور ان جیسے کاموں کو روبہ عمل لانا صرف حکومت کے فرائض میں ہے، اور اول و آخر حکومت ہی اس کی ذمہ دار ہے، اگر وہ اس کی بحالی میں غفلت اور کوتاہی سے کام لیتی ہے، یا چشم پوشی برتتی ہے، تو وہ خدا کے یہاں جوابدہ اور قوم کے سامنے ذمہ دار ہوگی۔

اگر حکومت ان ذمہ داریوں سے عہدہ برآ نہیں ہوتی، اور ان حقوق کی ادائیگی سے قاصر رہتی ہے، تو معاشرے کی بربادی اور بے بسی پر کفِ افسوس ملنے کے علاوہ اور کیا ہوسکتا ہے!!

جو حضرات بیمہ پالیسی کو اسلامی شریعت میں حرام قرار دیتے ہیں، ان کی یہ واضح اور نمایاں دلیلیں ہیں، اور ان کے نزدیک یہ پالیسیاں شریعت کے عام مقاصد اور اس کے بنیادی اصولوں کے منافی ہیں۔

آئندہ صفحات میں ہم مُجوِّزین اور مُحرِّمین کی دلیلوں کے درمیان موازنہ (COMPARISON) کریں گے، اور صرف موازنہ ہی پر بس نہ کریں گے، بلکہ اس کے بعد ترجیح بھی ضروری ہوگی، تاکہ امت ان نئے مسائل و مشکلات میں حلت و حرمت کے درمیان مخمصے اور پس و پیش میں نہ رہے، و علی اللہ قصد السبیل فمنہ نستمد العون و التسدید.

موازنہ اور ترجیح

ابھی ہم عرض کر چکے ہیں کہ موازنہ کے بعد ترجیح بھی ضروری ہوگی، تاکہ احکامِ شریعت پر کاربند اور اس کی حدود کا پابند مسلمان، بیمہ کو جائز قرار دینے والوں اور نا جائز قرار دینے والوں کے درمیان حیرت و تردد کے بھنور میں نہ مبتلا رہے، بلکہ ضروری ہے کو واضح اور واشگاف کر دیا جائے، تاکہ کسی شک وشبہہ اور تردد کے بغیر پورے اطمینان ویقین کے ساتھ اس کو اختیار کر کے اس پر عمل پیرا ہو سکے۔

فریقین کی ظاہری دلیلوں سے یہ بات منقح ہوتی ہے کہ بیمہ کو حرام قرار دینے والوں کی دلیلیں استنباط کے اعتبار سے زیادہ مضبوط، دلالت کے لحاظ سے زیادہ مکمل، حجت ہونے کی حیثیت سے زیادہ ٹھوس اور پُر زور اور شریعت کے نصوص اور اس کے عام قواعد سے زیادہ ہم آہنگ ہیں۔

اس کی وجوہ حسب ذیل ہیں:

۱- بیمہ کو جائز قرار دینے والے حضرات کا استناد ان قیاسی دلیلوں سے ہے، جن کو انھوں نے فقہا و مجتہدین کے استخراج کردہ مسائل سے اخذ کیا ہے؛ جبکہ وہ لوگ جو بیمہ کی حرمت کے قائل ہیں، انھوں نے شرعی نصوص اور ان بنیادی قواعد کو سند بنایا ہے، جن کے اختیار اور جن کے مقتضا پر عمل پر مجتہدین کا اتفاق ہے۔ اور قیاس واستنباط کی دلیلوں اور نصوص و قواعد کی دلیلوں کے درمیان فرق بہت واضح ہے۔

۲- بیمہ کو جائز قرار دینے والے لوگوں نے جواز کے لیے ان توجیہات و تاویلات پر اعتماد کیا ہے، جن کی نسبت کم از کم یہ کہا جا سکتا ہے کہ اس میں قمار، غرر،

رہان اور ربا کا مفہوم پایا جاتا ہے؛ اس کے علی الرغم جو حضرات اس کی حرمت کے قائل ہیں انھوں نے ان شرعی نصوص پر اعتماد کیا ہے، جو وضاحت اور قطعیت کے ساتھ یہ صراحت کرتی ہیں کہ بیمہ پالیسیاں ان نصوص کے ضمن میں داخل ہیں جو قمار کو حرام قرار دیتی ہیں، غرر کو حرام قرار دیتی ہیں، رِہان کو حرام قرار دیتی ہیں، اور ربا کو حرام قرار دیتی ہیں، اور اس تاویل کو اختیار کرنا جس کے گرد حرام کا شبہہ سر ابھارتا ہو، اور اس یقینی اور قطعی نص کو اختیار کرنا جس میں مناقشہ اور تاویل کی گنجائش نہ ہو، دونوں میں بڑا فرق ہے۔!!

۳- مجوزین نے جواز کے لیے باہمی امداد و کفالت کے ان نظریات پر اعتماد کیا ہے جن کے اصول کو اسلام نے ایک متکافل اور متناصر معاشرہ وجود میں لانے کے لیے وضع کیا ہے، جیسے عقد موالاۃ، نظام عواقل، اور نظام تقاعد و معاش (ریٹائرمنٹ اور پنشن کا نظام)۔ اور یہ چیز اپنے مضمون و مفہوم کے اعتبار سے جواز بیمہ کے لیے حجت نہیں بن سکتی، اس لیے کہ ان کا مدار تبرع، ذاتی محرک اور خیر کے کاموں میں حصہ لینے پر ہے۔ جبکہ ان حضرات نے جو بیمہ کی حرمت کے قائل ہیں، اس بات کو رد کر دیا ہے کہ بیمہ پالیسی کا امداد باہمی کے ان اصول و نظریات سے کوئی تعلق ہو، جن کو مجوزین نے حجت بنایا ہے، کیونکہ موجودہ بیمہ پالیسیاں نفع اندوزی، حصولِ زر اور سرمایہ داری پر قائم ہیں، اور ان کے دلائل کو ان یورپین ماہرین اقتصادیات کے اقوال تقویت پہنچاتے ہیں، جنھوں نے بیمہ پر تنقید کی ہے۔

۴- اسلامی شریعت کے مقررہ قواعد میں سے یہ ہے کہ:

جب مُحَرِّم (حرام کرنے والا) اور مُبیح (جائز کرنے والا) میں تعارض (CONTRADICTION) ہو، تو محرم راجح ہوگا، اور جب مانع (روکنے والا) اور مقتضی (تقاضا کرنے والا) کے درمیان تعارض پایا جائے تو مانع مقدم ہوگا۔

علماء اصول و اجتہاد کے ان متفق علیہ اور معتبر قواعد کی بنیاد پر، احوط پر عمل کرتے ہوئے، اس وجہ سے کہ وہ اباحت کے پہلو سے متعارض ہے، یہ جانتے ہوئے کہ مجوزین اور محرمین کی دلیلوں میں کوئی تعارض نہیں ہے اور محرمین کی قطعی دلیلوں اور ان کی صاف صاف اور واضح حجتوں کی وجہ سے ہم بیمہ پالیسی کی حرمت کے پہلو کو اختیار کرتے ہیں۔

۵:- بیمہ کو جائز کہنے والے حضرات یہ بات بھول گئے، یا اس کو دانستہ نظر انداز کر دیا کہ ہر شہری کے لیے امن و سلامتی کو یقینی بنانا، ان سماجی ضروریات (SOCIAL DUTIES) میں سے ہے جس کا شمار حکومت کی خصوصیات میں ہوتا ہے۔

لہذا یہ حضرات کسی فرد یا ادارہ یا کمپنی کے لیے یہ جواز کیسے فراہم کر سکتے ہیں کہ وہ زر اندوزی، ذاتی مفاد اور غلط طریقے سے حصول دولت و ثروت کے لیے اس سماجی ضرورت کا استحصال (EXPLOITATION) کرے۔

اگر بحالی امن میں حکومت اور سوسائٹی کے درمیان تعاون ہو، تو وہ صرف کارِ خیر، اور ایمانی جذبے اور اجر و ثواب کے حصول کے لیے ہوگا۔ اور کبھی سوسائٹی کی طرف سے یہ تعاون اداء فرض کے لیے ہوتا ہے، مثال کے طور پر اگر کوئی مسلمان یہ جانتا ہے کہ کوئی آدمی بھوک یا پیاس کی وجہ سے موت کے قریب ہے، پھر اس کی چارہ جوئی میں وہ کوتاہی کرے، حتی کہ وہ ہلاک ہو جائے، تو شریعت کی نگاہ میں وہ قاتل سمجھا جائے گا، اور گناہ گار ہوگا!

بصورت دیگر اگر یہی تعاون ذاتی مصالح اور مادی مفادات اور ناحق طریقے سے مال کھانے پر قائم ہو، تو یہ اس گمراہی اور پستی کے دور میں ایمان و وجدان اور رحمت و مروءت اور خیر سگالی کے جذبات کا افسوسناک فقدان ہے!!

اور یہ معلوم ہے کہ اگر بیمہ کا دروازہ کھول دیا جائے، تو وہ انسانی معاشرے کو بدترین تصورات، نفع اندوزی کے شرمناک افعال اور بے حیائی اور اباحیت پسندی کے انتشار تک پہنچادے گا، چنانچہ ہم نے کتنے شرمناک، رسوا خیز بیموں کے بارے میں سنا ہے، جو اخلاق وشرافت کے معمولی تصور کے بھی منافی ہیں، جیسے بدکردار عورتوں کے حسن وجمال کا بیمہ، رقاصاؤں کی پنڈلیوں اور مغنیوں کی آوازوں کا بیمہ اور اسی طرح کے نہ جانے کتنے اخلاق سوز بیمے ہیں۔

پروفیسر شیخ ابوزہرہ رحمۃ اللہ علیہ نے شیخ زرقاء کا جواب دیتے وقت کتنے پتے کی بات کہی ہے، کہ یہودی ذہن نے مغربی اور مشرقی سوسائٹی میں بیمہ کا خیال پیدا کیا ہے، تا کہ عالمِ انسانیت میں استحصال اور زراندوزی کے اسباب ایجاد کرے، اور دولت وثروت کے وسائل پر اپنے کنٹرول کو مضبوط کرے، اس کا محرک اس کا وہ خبیث نظریہ ہے کہ وسیلہ مقصد کے لیے جواز فراہم کرتا ہے۔

کیا بیمہ کو جائز قرار دینے والے حضرات ان حقائق کو تسلیم اور ان عیوب کا اعتراف کریں گے؟

کیا جس کو جائز اور مباح کیا ہے اس پر نظر ثانی فرمائیں گے؟

ہم مذکورہ بالا دلائل کا موازنہ (COMPARISON) اور ترجیح (PREFERENCE) کے بعد جن نتائج تک پہنچتے ہیں وہ یہ ہیں:

تمام اقسام کی بیمہ پالیسیاں ناحق مادی کمائی، بے محنت زراندوزی اور غلط طریقے سے حصول دولت کا ذریعہ ہیں، یہ اس کمائی کی طرح ہیں جس کو اسلامی شریعت نے حرام قرار دیا ہے، جیسے قمار، بیع غرر، رہان، اور سود وغیرہ کے ذریعہ کی گئی کمائیاں ہیں، لہذا جو کوئی شخص کسی کے مجبور کیے بغیر اپنے اختیار اور آزادی سے بیمہ کمپنیوں کے ساتھ معاملہ کرتا ہے، تو وہ حرام اور گناہ کا کام کرتا ہے، اور اس راستے سے اس کو جو بھی

دولت حاصل ہوگی وہ مالِ حرام اور کسب حرام ہوگا، اور جو کوئی اس کی ترویج اور اس کی ترغیب کے لیے ادارے قائم کرے گا، تو وہ گناہ کی طرف دعوت دینے والا اور فعل حرام کا رائج کرنے والا ہوگا۔ اور انشورنس کے یہ ادارے حرمت و گناہ میں قمار یا ربا کے اداروں سے کسی طرح کم نہیں، اس وجہ سے کہ ان دونوں کے درمیان قدر مشترک ناحق طریقے سے مال ہتھیانا اور بغیر کسی عوض کے معمولی کوشش سے دولت سمیٹنا ہے، اور فرد کے بگاڑ اور سوسائٹی کے انحطاط میں اس کے نفسیاتی، اخلاقی، معاشرتی اور اقتصادی اثرات جو مرتب ہوتے ہیں وہ اس کے علاوہ ہیں۔

خدا سے دعا ہے کہ وہ ہم کو حق کو حق سمجھنے اور اس کی پیروی کی، اور باطل کو باطل سمجھنے اور اس سے بچنے کی توفیق عطا فرمائے، اور قول و عمل میں ہم کو ہمیشہ سیدھی راہ پر گامزن رکھے، آمین!!

مگر متبادل کیا ہے؟

اوپر ہم بیان کر چکے ہیں کہ معاشرہ میں عدل وانصاف قائم کرنا، ظلم وستم کی بیخ کنی کرنا، تمام باشندگانِ وطن کے لیے امن کو یقینی بنانا، اور ہر انسان کے حق کی حفاظت کرنا، یہ دراصل حکومت کے فرائض میں ہے، اس لیے کسی فرد، یا کمپنی یا تنظیم کے لیے یہ جائز نہیں کہ مادی مفادات اور ذاتی مصلحتوں کے لیے اس کا غلط استعمال کرے، اس لیے میں ضروری سمجھتا ہوں کہ اسلامی حکومت کے موقف کو- اس کے اس باشندے کے تئیں جو اس کے زیر سایہ زندگی گزارتا ہے- بیان کروں، تاکہ قارئین کو معلوم ہو جائے کہ اسلام نے باہمی کفالت کے ایسے نظریات اور ایسے سماجی اصول و ضوابط وضع کیے ہیں، جو ہر انسان کے لیے معاشی یگانگت اور انسانی شرافت کو رو بہ عمل لاتا ہے، اور تاکہ آپ جان لیں کہ ہماری اور ہمارے معاشرے کی بھلائی اسی میں ہے کہ ہم ان اصول ونظریات پر کاربند رہیں، بجائے اس کے کہ ہم ایسے ممالک سے اصول وضوابط حاصل کریں، جن کو حصول دولت ولذت، جنس پرستی، دنیاوی زندگی کی رونق سے لطف اندوزی اور شہوت واباحیت کے پیچھے بے مہار بھاگنے کے سوا اور کوئی کام نہیں۔

سطور ذیل میں اسلام کے وضع کردہ اہم اصول پیش خدمت ہیں:

ا- حکومت کا تواناؤں کے لیے کام کے اسباب و وسائل مہیا کرنا: اس حدیث کی وجہ سے جس کو ابوداؤد، ترمذی اور بیہقی نے روایت کیا ہے کہ ایک شخص سائل بن کر رسول اللہ ﷺ کی خدمت میں حاضر ہوا- حالانکہ وہ توانا و تندرست تھا- آنحضرت ﷺ نے اس سے دریافت فرمایا کہ کیا تمھارے گھر میں کوئی چیز نہیں ہے؟

اس نے کہا کیوں نہیں! ایک ٹاٹ ہے، جس کا کچھ حصہ ہم پہنتے ہیں، اور کچھ حصے کو ہم بچھاتے ہیں؛ اور ایک پیالہ ہے جس میں ہم پانی پیتے ہیں۔ آنحضرت ﷺ نے فرمایا: یہ دونوں چیزیں میرے پاس لاؤ، وہ شخص دونوں چیزیں لایا، آپ ﷺ نے ان کو اپنے دست مبارک میں لیا، اور فرمایا کہ ان کو کون خریدے گا؟ ایک شخص نے عرض کیا کہ میں یہ دونوں چیزیں ایک درہم میں لوں گا۔ آپ ﷺ نے فرمایا کہ ایک درہم سے زیادہ کون دے گا؟ آپؐ نے دو تین بار یہی فرمایا، ایک آدمی نے کہا کہ میں ان کو دو درہم میں لوں گا۔ آنحضرت ﷺ نے وہ چیزیں اس شخص کے حوالے کر دیں، اور دونوں درہم لے کر اس انصاری آدمی کے حوالے کر دیا، اور اس سے فرمایا کہ ایک درہم سے کھانا خرید کر اپنے اہل وعیال کو کھلاؤ، اور دوسرے سے کلہاڑی خرید کر میرے پاس لاؤ۔ وہ آدمی کلہاڑی خرید کر لایا تو رسول اللہ ﷺ نے اپنے دست مبارک سے اس میں لکڑی لگائی، پھر فرمایا کہ جاؤ لکڑی کاٹو، اور دیکھو پندرہ دن تک تم نظر نہ آنا، اسنے ایسا ہی کیا، پھر جب وہ آیا تو اس کے پاس دس درہم تھے، کچھ سے اس نے کپڑے خریدے، کچھ سے اشیاء خوردنی خریدی؛ اس وقت آنحضرت ﷺ نے فرمایا کہ یہ اس سے بہتر ہے کہ تم قیامت کے دن اس حالت میں آؤ کہ تمھارے چہرے پر سوال (بھیک مانگنے) کا دھبہ ہو؛ سوال کرنا تین ہی قسم کے لوگوں کے لیے روا ہے: ایک سخت فاقہ کش کے لیے، دوسرے بہت زیادہ مقروض کے لیے، یا پھر تکلیف دہ خون والے کے لیے۔(۱)

۲- حکومت کا محتاجوں اور بے بسوں کی کفالت کو یقینی بنانا: اس حدیث کی وجہ

---

(۱) دم موجع (تکلیف دہ خون) سے مراد وہ شخص ہے، جس کے اوپر اپنے کسی رشتہ دار قاتل کی ایسی دیت کی ادائیگی کا بار ہے، جس کو اسے مقتول کے اولیاء کو ادا کرنا ہے، اور اگر اس نے ایسا نہ کیا تو اس کا وہ قریبی شخص قتل کر دیا جائے گا، جس کی وجہ سے اس کو دکھ ہوگا۔

سے جس کو بخاری و مسلم نے روایت کیا ہے کہ آنحضرت ﷺ نے فرمایا کہ میں ہر آدمی کا اس کے نفس سے زیادہ حقدار ہوں، کوئی اگر مال و دولت چھوڑ کر جاتا ہے، تو وہ اس کے وارثوں کا ہوگا، اور اگر کوئی شخص قرض یا چھوٹے بچوں کو چھوڑ کر مرتا ہے، تو اس قرض کی ادائیگی اور ان کی دیکھ ریکھ میرے ذمہ ہے۔

اس یقین دہانی کے ضمن میں درج ذیل قسموں کی کفالت آتی ہے:

۱- یتیم کی کفالت۔

۲- راستہ میں پائے گئے بچے کی کفالت۔

۳- آفت زدہ لوگوں کی کفالت۔

۴- بے یار و مددگار شخص کی کفالت۔

۵- مطلقہ عورتوں اور بیواؤں کی کفالت۔

۶- بوڑھوں اور بے بس لوگوں کی کفالت۔

۷- مصیبت زدہ اور پریشان حال لوگوں کی کفالت۔

۸- محدود آمدنی والے مسکینوں اور ناداروں کی کفالت۔

یہ وہ لوگ ہیں جن کی نگہداشت اور دیکھ بھال کی ذمہ داری بیت المال انجام دے گا، خواہ وہ غیر مسلم ہی کیوں نہ ہو، جب تک وہ ذمی رہیں۔ اس کی تائید اس سے ہوتی ہے کہ حضرت عمر رضی اللہ عنہ بھیک مانگنے والے ایک بوڑھے آدمی کے پاس سے گزرے، اس نے ان کی توجہ اپنی طرف مبذول کی، آپؓ نے اس سے دریافت فرمایا کہ بڈھے یہ کیا کر رہے ہو؟ اس نے کہا: ذمی ہے (وہ آدمی یہودی تھا) جو جزیہ اور صدقہ کا سوال کرتا ہے، تو حضرت عمرؓ نے اس سے فرمایا کہ ہم نے تمھارے ساتھ انصاف کا معاملہ نہیں کیا، تمھاری جوانی کی کمائی کھائی اور بڑھاپے میں دریوزہ گری کے لیے چھوڑ دیا؟ پھر وہ اس کو اپنے گھر لے گئے اور گھر میں جو کچھ موجود پایا، اس کو اٹھا

کر دے دیا، پھر بیت المال کے خازن کو کہلا بھیجا کہ اس جیسے لوگوں کی نگہداشت کرو، اوران کے لیے بیت المال سے اتنی رقم مقرر کردو جوان کے اوران کے اہل وعیال کے لیے کافی ہو، ﴿إنما الصدقات للفقراء و المساكين﴾ [صدقات فقراء اور مساکین ہی کے لیے ہوتے ہیں (۱)، اور یہ اہل کتاب کے مسکینوں میں سے ہے۔

۳۔حکومت کا معیشت کی معمولی حد کو یقینی بنانا: اس حدیث کی وجہ سے جس کو طبرانی نے آنحضرت ﷺ سے روایت کیا ہے، کہ آپؐ نے فرمایا کہ اللہ تعالی نے مسلمان دولتمندوں پر ان کے مال میں اتنی مقدار فرض کی ہے، جو ان کے فقراء کے لیے کافی ہو سکے، اور فقراء کو بھوک یا ننگے پن کی جو مشقت لاحق ہوتی ہے، تو وہ ان کے دولت مندوں کی کارستانی کا نتیجہ ہوتی ہے، اور آگاہ ہو جاؤ کہ اللہ تعالی ان کا سخت محاسبہ کرے گا، اوران کو دردناک عذاب دے گا۔

اس حدیث سے یہ نتیجہ نکلتا ہے کہ دولتمندوں کے مال کی زکوٰۃ جو فرض کی گئی ہے، وہ اتنی مقدار ہے جو فقراء کے لیے کافی ہو سکتی ہے، اور کفایت کا تعلق مناسب رہائش، مناسب غذا اور مناسب لباس کی فراہمی سے ہے۔ اور اگر زر و دولت والے اس حق کی ادائیگی میں کوتاہی سے کام لیتے ہیں، تو اللہ تعالیٰ آخرت میں ان کو سخت حساب اور دردناک عذاب کی وعید فرماتا ہے۔ اور رہا سوال دنیا کا تو حکومت ان کو سزا دے گی اوران کے ہاتھ سے زکوٰۃ اس طرح وصول کرے گی کہ وہ رسوا ہوں گے۔

اور اسی لیے حضرت عمرؓ کا اس باب میں عمل یہ تھا کہ وہ ہر نومولود کے لیے اس کے باپ کے عطیہ کے ساتھ سو درہم عطیہ مقرر کر دیتے تھے، اور جیسے جیسے بچہ بڑا ہوتا

---

(۱) اس آدمی کو حضرت عمرؓ نے عام بیت المال سے عطیہ دیا تھا، اور زکوٰۃ کا جو بیت المال ہے تو وہ صرف مسلمانوں کے لیے خاص ہوگا۔ اس قصہ کو امام ابو یوسفؒ نے کتاب الخراج میں روایت کیا ہے۔

تھا، اس کے عطیہ میں اضافہ ہوتا رہتا تھا، اور ان کے بعد اسی طریقے پر حضرت عثمانؓ، حضرت علیؓ اور دوسرے خلفا بھی عمل پیرا رہے (۱)۔

۴۔حکومت کا ہر باشندے کے لیے راستہ کے امن کو یقینی بنانا۔ ہم نے اوپر حضرت عمرؓ کا یہ ارشاد ذکر کیا ہے کہ آپ نے فرمایا: خدا کی قسم اگر عراق کے دور افتادہ علاقے میں ایک اونٹنی بھی پھسل جائے تو مجھے اندیشہ ہے کہ عمر سے اس کے بارے میں باز پُرس نہ کی جائے کہ تو نے اس کے راستے کو ہموار کیوں نہیں کیا۔

تو راستے کو ہموار اور برابر کرنا اور مختلف شہروں کے درمیان مواصلات کا انتظام کرنا، اور راستوں اور گزرگاہوں کا فسادیوں اور رہزنوں سے پاک کرنا، سب سے بڑا حق ہے جو اسلامی حکومت پر ملک اور پبلک کے اندر امن وسلامتی کے وجود میں لانے کے لیے عائد ہوتا ہے؛ اگر حکومت اس میں کوتاہی کرتی ہے، تو وہی اس کی ذمہ دار اور اس کے بارے میں جواب دہ ہوگی۔ آنحضرت ﷺ کے اس ارشاد کی وجہ سے کہ :الإمام راعٍ و مسئولٌ عنْ رَعيَّتِهِ [امام (حاکم) ایک چرواہا ہے اور اس سے اس کے ریوڑ کے بارے میں باز پُرس کی جائے گی]۔ بلکہ ہم دیکھتے ہیں کہ شریعت اسلامیہ نے ان لوگوں کے لیے جو امن وسلامتی کو چیلنج کرتے ہیں اور اس کے لیے خطرہ بنتے ہیں، زمین میں فساد برپا کرتے ہیں اور پُرامن ماحول کو تارتار کرتے ہیں، سخت سزائیں مقرر کی ہیں، چنانچہ ان کی سزا یہ ہے کہ ان کو قتل کیا جائے، یا ان کو سولی پر لٹکایا جائے (گلے میں پھانسی کا پھندا ڈالا جائے)، یا ان کا ایک طرف کا ہاتھ اور دوسری جانب کا پاؤں کاٹ ڈالا جائے، یا ان کو شہر بدر اور جلاوطن کردیا جائے، خداوند قدوس نے فرمایا ہے: ﴿إِنَّمَا جَزَاءُ الَّذِينَ يُحَارِبُونَ اللَّهَ وَ رَسُولَهُ وَ يَسْعَوْنَ فِي الْأَرْضِ فَسَاداً أَنْ يُقَتَّلُوا أَوْ يُصَلَّبُوا أَوْ تُقَطَّعَ أَيْدِيهِمْ وَ أَرْجُلُهُمْ

(۲) کتاب الاموال لابی عبید ص ۲۳۷۔

مِنۡ خِلافٍ أَوۡ يُنۡفَوۡا مِنَ الارۡضِ ذٰلِكَ لَهُمۡ خِزۡيٌ فِيۡ الدُّنيا وَ لَهُمۡ فِيۡ الآخِرةِ عَذابٌ عَظِيۡمٌ﴾ (المائدة:۳۳)

۵-حکومت کا حادثہ کے شکار لوگوں کی کفالت کی تامین: اگر کسی انسان کو گاڑی کے ٹکراؤ یا کشتی کی غرقابی یا اس جیسا حادثہ پیش آجائے، اور اس کے نتیجے میں مال کا زیاں، اس کی بربادی، یا غرقابی پیش آجائے، تو حکومت اسلامیہ کا فرض ہے کہ اس کی دستگیری کرے، اس کے قرض کو ادا کرے، اور اس کو جو خسارہ ہوا ہے، اس کا عوض بہم پہنچائے، اسی کو ہماری آج کی اصطلاح میں حادثہ کا بیمہ کہا جاتا ہے، ہمارے پاس اس تامین کے ثبوت کے لیے حدیث میں دلیل موجود ہے۔

امام مسلم نے صحیح مسلم میں اور ابو داود اور نسائی نے (ابو) بشر قبیصہ بن المخارق رضی اللہ عنہ سے روایت کیا ہے کہ انھوں نے فرمایا کہ میں نے ایک حمالہ (۱) کی ذمہ داری لی، پھر میں آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کے پاس آیا کہ اس کے بارے میں آپؐ سے سوال کروں (مانگوں)، آپ نے فرمایا: ذرا انتظار کرلو تاکہ صدقہ کا مال (بیت المال کا ایک ذریعہ آمدنی) آجائے، تو ہم اس میں سے تمھارے واسطے حکم دیں گے، پھر آپ نے فرمایا کہ قبیصہ! سوال صرف تین قسم کے لوگوں کے لیے جائز ہے۔

ایک وہ شخص جس نے حمالہ کا بوجھ اٹھایا ہے، تو اس کے لیے سوال کرنا جائز ہے، یہاں تک کہ اس کو پورا کرے، پھر اس سے رک جائے۔

دوسرا وہ آدمی جس کے ساتھ کوئی ایسا حادثہ رونما ہوا کہ اس کا مال اس کی نذر ہو گیا، تو اس کے لیے سوال کرنا، مانگنا جائز ہے، یہاں تک زندگی کا قوام اس کو میسر آجائے۔

---

(۱) وہ ذمہ داری جو اپنے مال سے دو گروہوں کے درمیان صلح کرانے والا اپنے سر لیتا ہے، تاکہ ان دونوں گروہوں کے درمیان قتال وغیرہ کا خاتمہ ہو جائے۔

تیسرا وہ آدمی جو فاقہ کا شکار ہو، حتی کہ اس کی قوم کے تین صاحب عقل شخص یہ کہہ دیں کہ فلاں کو فاقہ لاحق ہو گیا ہے، تو اس کے لیے بھی دست سوال دراز کرنا جائز ہوگا، تا آنکہ اس کو زندگی کا قوام میسر آ جائے۔ تو اے قبیصہ! ان کے علاوہ جو بھی سوال ہوگا، وہ مالِ حرام ہوگا، جس کو مانگنے والا حرام طریقے سے کھائے گا۔

۶- حکومت کا افراد کے درمیان اقتصادی توازن کی تامین: اور یہ چیز مالِ فے اور غنیمت (۱) اور اس جیسے دوسرے مالی عطیوں کی تقسیم سے انجام پذیر ہوتی ہے، اس لیے کہ یہ اموال حاجتمندوں کو دیے جاتے ہیں، اور خوشحال و فارغ البال لوگوں سے صرف نظر کیا جاتا ہے؛ تا کہ سوسائٹی کے مختلف طبقوں کے مابین اقتصادی توازن اور سماجی انصاف قائم ہو سکے، اور اس کا ثبوت خود آنحضرت ﷺ کے عمل سے ملتا ہے کہ آپ ﷺ نے جب بنو نضیر کے فے پر قبضہ کیا، تو اس کو خاص طور سے مہاجرین میں تقسیم کیا، اور انصار کو اس سے کچھ نہیں دیا سوائے تین لوگوں کے، اور وہ تین حضرات: ابو دجانہ، سہل بن حنیف اور حارث بن الصمہ تھے، کیونکہ یہ حضرات مسکین اور نادار تھے (۲)۔ اور آنحضرت ﷺ نے عطیوں کی تقسیم میں یہ تصرف، توازن اور عدل و مساوات کے پیش نظر فرمایا تھا، کیونکہ مہاجرین اپنے گھر بار اور مکہ میں اپنا مال چھوڑ دینے کی وجہ سے بخشش کے اوروں سے زیادہ مستحق تھے۔

۷- حکومت کا بوقتِ ضرورت بعض افراد کے ذریعہ بعض کی کفالت کو یقینی بنانا: مصائب اور بحرانی حالت میں حکومت اسلامیہ کی یہ ذمہ داری ہے کہ خوشحال اور

---

(۱) فے: وہ مال جو دشمن سے بغیر لڑائی کے حاصل ہوتا ہے۔ غنیمت: وہ مال جس کو مسلمان دشمنوں سے لڑ کر حاصل کرتے ہیں۔ مال غنیمت کا پانچواں حصہ تقسیم رسول پر، ذوی القربیٰ پر، یتیموں پر، مسکینوں پر، اور مسافروں پر ہوتی ہے، اور چار حصے مجاہدین میں تقسیم کیے جاتے ہیں۔

(۲) تفسیر قرطبی ۱۸/۱۱

دولتمند حضرات پر یہ فرض قرار دے کہ سوسائٹی کے افراد کے درمیان اجتماعی عدل و مساوات کی بحالی کے لیے نادار حاجتمندوں کی کفالت میں اپنا کردار ادا کریں۔ اور ہمارے لیے اس کی دلیل آنحضرت ﷺ کا یہ عمل ہے کہ ہجرت مدینہ کے بعد آپؐ نے جو امور انجام دیے منجملہ ان کے یہ ہے کہ آپؐ نے مہاجرین اور انصار کے درمیان مواخات قائم فرمائی، ہر انصاری کے لیے مہاجرین میں سے ایک کو بھائی بنایا، چنانچہ انصاریؓ اپنے مہاجرؓ بھائی کو اپنے گھر لے جاتے تھے، اور ان کے سامنے یہ پیشکش کرتے تھے کہ ان کے گھر کی ہر چیز تقسیم کرلیں (۱)۔

یہ بات معلوم ہے کہ مہاجرین وہ لوگ تھے، جنھوں نے راہِ خدا میں اپنا گھر بار اور مال واسباب سب کچھ چھوڑ دیا اور مدینہ اس حال میں وارد ہوئے کہ دنیا کی کوئی چیز ان کے پاس نہیں تھی، اور انصارِ مدینہ اپنی کھیتیوں، اپنے مال و دولت اور تجارت کی وجہ سے غنی اور مالدار تھے، اس لیے ضروری تھا کہ ایک بھائی (انصاری) دوسرے بھائی (مہاجر) کا بوجھ اٹھائے، اس کو اپنے گھر میں جگہ دے، اور اپنے مال میں اس کو حصہ دار بنائے۔

کیا دنیا کا کوئی سماجی عدل و انصاف اس اخوت اور بھائی چارگی کی مثال پیش کرسکتا ہے؟

۸- افراد کے درمیان کفالت اور باہمی امداد کے نظریہ کی سرپرستی: ایک خاندان، یا ایک محلّہ، یا ایک پیشہ کے افراد کے درمیان کفالتی تعاون کا نظریہ، ان بنیادی نظریات میں سے ہے جن کا اسلام نے حکم دیا اور اس کی طرف دعوت دی ہے۔ اس سلسلہ میں اسلام کے جو اصول و نظریات ہیں وہ پیش خدمت ہیں:

☆ ﴿وَ تَعَاوَنُوا عَلَى الْبِرِّ وَ التَّقْوٰى﴾ [المائدۃ:۲]

---

(۱) سیرت نبویہ از ڈاکٹر مصطفیٰ سباعی رحمۃ اللہ علیہ

☆﴿وَيُؤْثِرُوْنَ عَلٰىٓ اَنْفُسِهِمْ وَلَوْ كَانَ بِهِمْ خَصَاصَةٌ﴾ [الحشر: ۹]

-((مَا آمَنَ بِي مَنْ بَاتَ شَبْعَانَ وَ جَارُهُ جَائِعٌ إِلٰى جَنْبِهِ وَ هُوَ يَعْلَمُ بِهِ)) بزار وطبرانی۔ یعنی وہ شخص مجھ پر ایمان نہیں لایا جس نے شکم سیر ہو کر رات گزاری درانحالیکہ اس کے بغل میں اس کا ہمسایہ بھوکا ہے، اور اس کو اس کے بھوکے ہونے کا علم ہے۔

-((مَنْ كَانَ عِنْدَهُ طَعَامُ اثْنَيْنِ فَلْيَذْهَبْ بِثَالِثٍ، وَ مَنْ كَانَ عِنْدَهُ طَعَامُ أَرْبَعَةٍ فَلْيَذْهَبْ بِخَامِسٍ أَوْ سَادِسٍ)) [مسلم] یعنی جس کے پاس دو آدمیوں کا کھانا ہو تو وہ تیسرے کو لے جائے (اپنے کھانے میں شریک کرے) اور جس کے پاس چار آدمیوں کا کھانا ہو، تو پانچویں یا چھٹے کو لے جائے۔

-((مَثَلُ الْمُؤْمِنِيْنَ فِي تَوَادِّهِمْ و تَرَاحُمِهِمْ وَ تَعَاطُفِهِمْ كَمَثَلِ الْجَسَدِ، إِذَا اشْتَكىٰ عُضْوٌ مِنْهُ تَدَاعىٰ لَهُ سَائِرُ الْجَسَدِ بِالسَّهَرِ وَ الْحُمّٰى)) [مسلم] یعنی مومنوں کی باہمی محبت، رحمدلی اور ہمدردی کی مثال جسم کی طرح ہے، کہ جسم کا کوئی حصہ بیمار ہوتا ہے، تو باقی جسم بھی بخار اور بیداری میں مبتلا ہو جاتا ہے۔

-((لَا يُؤْمِنُ أَحَدُكُمْ حَتّٰى يُحِبَّ لِأَخِيْهِ مَا يُحِبُّ لِنَفْسِهِ)) [صحیحین] یعنی تم میں کا کوئی شخص اس وقت تک مومن نہیں ہو سکتا، جب تک کہ اپنے بھائی کے لیے بھی وہی پسند نہ کرے جو اپنے لیے پسند کرتا ہے۔

ان نصوص سے یہ بات آشکارا ہو جاتی ہے کہ سوسائٹی میں باہمی کفالت و امداد کے اداروں کا قیام اسلام کے بنیادی اصول اور قانون سازی کے عام مقاصد میں سے ہے۔

لیکن اسی کے ساتھ ان اداروں پر اسلامی نقطۂ نظر سے باہمی کفالت کا نظام

ہونا مندرجہ ذیل شرائط کے بغیر صادق نہیں آ سکتا(۱):

۱- حصہ دار اپنے مال کا حصہ بطور تبرع اور بھائی چارگی کو قائم کرنے کے لیے ادا کرے۔

۲- اگر اس جمع شدہ مال سے فائدہ اٹھانے کا ارادہ کیا جائے، تو صرف جائز طریقہ سے ایسا کیا جا سکتا ہے۔

۳- کسی فرد کے لیے یہ جائز نہیں کہ کسی چیز کا تبرع کرے، تو اس کے ساتھ یہ شرط لگا دے کہ اگر اس کو کوئی حادثہ پیش آئے گا، تو اس کے عوض میں ایک مقرر رقم حاصل کرے گا؛ البتہ اس کو لوگوں کے مال میں سے ان کی حالت کا لحاظ کرتے ہوئے اتنا دے دیا جائے کہ اس کے پورے یا کچھ نقصان کی مکافات کر سکے۔

۴- تبرع ایک ہبہ ہے اور اس کا واپس لینا حرام ہے(۲)، اس کی دلیل آنحضرت ﷺ کی یہ حدیث ہے: ((الرَّاجِعُ فِي هِبَتِهِ كَالرَّاجِعِ فِي قَيْئِهِ))۔

اگر یہ شرائط کسی ایسے کفالتی نظام میں پائے جائیں، جو ہمارے ملک میں قائم تنظیموں اور اداروں میں موجود ہو، تو یہ تعاون خالص اسلامی اصول ونظریات کا حامل ہوگا، بلکہ اسلامی شریعت اس کو مبارکباد دے گی، اس کو خوش آمدید کہے گی، اور جو اس میں حصہ لے گا اس کو رحمدل اور ہمدرد مسلمان سمجھے گی، اس کو قیامت کے دن اجر و ثواب ہوگا!!۔

☆......☆......☆......☆

یہ اہم کفالتی اصول ونظریات ہیں، جن کو اسلام نے سوسائٹی میں عدل و انصاف کے قیام، ظلم و تعدی کی بیخ کنی، تمام باشندوں کے لیے امن وسلامتی کی

(۱) ان شرائط کا ذکر ڈاکٹر عیسیٰ عبدہ نے اپنی کتاب "التامين الأصيل و البديل" میں کیا ہے۔
(۲) کچھ لوگوں کا قول ہے کہ ہبہ کو لوٹانا مکروہ ہے۔

فراہمی، اور تمام انسانوں کے حقوق کے تحفظ کے لیے وضع کیا ہے۔

یہ وہ اصول ہیں جو ان تمام لوگوں کے لیے جو اسلام کے زیر سایہ اور اس کے نظام کے ماتحت زندگی بسر کرتے ہیں، محبت، اخوت، خیر سگالی، امداد باہمی، رحم دلی اور عدل اجتماعی کا پیغام دیتے ہیں۔

اس لیے امت مسلمہ کی بھلائی اسی میں ہے کہ ہر اس درآمد شدہ نظام کو ٹھکرا دیں، جو مشرق و مغرب سے اٹھنے والی ہواؤں کے دوش پر آیا ہو، کیونکہ یہ تمام نظام اور یہ سارے سسٹم ہمارے لیے اجنبی اور ناآشنا ہیں، یہ ہماری شریعت کے موافق نہیں ہیں، اور نہ ہمارے مذہب کے اصول وافکار سے کسی طرح میل اور لگا کھاتے ہیں۔

کیا وجہ ہے کہ ہم دوسروں سے نظام و قانون حاصل کرتے ہیں، جبکہ ہمارے پاس خود اسلام کا خدائی قانون موجود ہے، جو ہمارے دنیوی امور کو منظم کرتا ہے، ہماری آخرت کو سنوارتا ہے، اور ہماری قوم کے لیے عزت وعظمت کی ضمانت فراہم کرتا ہے۔ اور قارئین کرام! آپ اوپر ان کفالتی اصول ونظریات کو ملاحظہ فرما چکے ہیں، جن کو اسلام نے انسان کی باعزت اور آزاد زندگی کی ضمانت، اور اگر اس کو کوئی خطرہ لاحق ہو، یا کوئی حادثہ پیش آجائے، تو کافی امدادی ضمانتوں کے حصول کے لیے وضع کیا ہے۔

برادران اسلام! کیا آپ کو یہ اطمینان نہیں ہے کہ اسلام اپنی ابدی شریعت، اور اپنے فیاضانہ نظام کی وجہ سے فرد کی عزت نفس، خاندان کی شیرازہ بندی، معاشرہ کی خوش بختی اور انسانیت کے جماؤ کو باقی رکھتا ہے؟

کیا آپ کو یقین نہیں ہے کہ باہمی کفالت کے لیے اسلام نے جو حل پیش کیا ہے، وہ ہر متوقع احتمال کے سد باب، اور ہر امکانی رخنہ (LOOPHOLE) کو دور کرنے کا سب سے بڑا حل ہے؟

کیا آپ کا یہ عقیدہ نہیں ہے کہ قوانین جب خدائی ہوں گے، تو اس میں کوئی کسر نہیں ہوگی، اور نہ کوئی نقص ہو سکتا ہے؟

کیا آپ نے سنا نہیں ہے کہ ماضی میں جب امت مسلمہ اسلامی شریعت پر عمل پیرا تھی، تو عزت و ترقی، تہذیب تمدن اور قوت و طاقت کے اعتبار سے سب سے بہتر قوم تھی؟!

جب صورتحال یہ ہے تو کیا وجہ کہ ہمارے نوجوان اسلام سے بے رخی برتتے ہیں؟ اور کیا وجہ ہے کہ حقیقت سے چشم پوشی اور گریز کرتے ہیں؟ اور کیا وجہ ہے کہ اپنی توجہ کا قبلہ مشرق و مغرب کو بنا رکھا ہے؟

اے فتنہ کے شکار حیران و سرگرداں نوجوانو! کوشش کرو کہ اسلام کی حقیقت کو سمجھ سکو، اس کے اصول و قوانین کا علم حاصل کر سکو، اور اس کی ہمہ گیری اور ہمہ جہتی کا گہرائی سے مطالعہ کر سکو؛ یہاں تک کہ تم چشمِ حقیقت سے یہ دیکھ لو کہ اسلام کو اللہ تعالیٰ نے بشریت کے واسطے ابدی نظام اسی لیے بنایا ہے کہ بندگانِ خدا کو خدا کی بنائی ہوئی چیزوں کی پرستش سے نجات دلا کر خدا کی بندگی تک رہنمائی کرے، دنیا کی تنگی سے نکال کر اس کی وسعت تک، اور مذاہب کے ظلم و ستم سے نجات دلا کر اسلام کی بارگاہِ عدل و انصاف تک پہنچائے۔

اس نے اسلامی شریعت کو اس لیے اتارا ہے تا کہ انسانیت کو ہر وقت اور ہر جگہ عدل و انصاف، حق، آزادی، مساوات، اور امن و سلامتی مہیا فرمائے۔

نوجوانو! اگر تم خالی الذہن ہو کر انصاف کے ساتھ سمجھنے کی کوشش کرو، تو یقین ہے کہ بالآخر تعمیر و ترقی اور حاکمیت و ابدیت میں اسلام کی عظیم الشان حقیقت کا اقرار کر لو۔

خداوند کریم نے قرآن پاک میں صحیح فرمایا ہے کہ: الیوم اکملت لکم

دینکُمْ وَ اَتْمَمْتُ علیکُمْ نِعْمَتِی وَ رَضِیْتُ لَکُمُ الإسلامَ دیناً﴾

و آخر دعوانا أن الحمد لله رب العالمین.

٢٥ رمضان ١٣٩٧ھ = ٨ ستمبر ١٩٧٧ء — مؤلف: عبداللہ ناصح علوان

٢٣ صفر ١٤٢٣ھ = ٧ مئی ٢٠٠٢ء — مترجم: مسعود احمد الاعظمی